زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

جلد دوئم : شمارہ : ۱۸۔ جنوری ۹۴ء

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ ---------- سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول ---------- گلزار جاوید

مجلس مشاورت

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ رانی —— حمیرا رحمن (نیویارک) —— ڈاکٹر افضل اقبال

قیمت

فی شمارہ	18 روپے
چھ شمارے	104 روپے
زرِ سالانہ	200 روپے

بیرون ملک
(ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ : ۴۵۶۹-۲-گوالمنڈی راولپنڈی - ۴۶۰۰۰ فون - ۵۴۰۵۶۹ فیکس 419040

پبلشر: گلزار جاوید، طابع فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

ترتیب

تحدیثِ نعمت

سید ضمیر جعفری

کس قدر شائستہ اعزاز فرمایا مجھے
پھر مدینے میں مرے آقا نے بلوایا مجھے

شہرِ جاناں میں گدائی کی سعادت پھر ملی
خاکِ یثرب اوڑھ کر سونے کی راحت پھر ملی

یہ تری دریا سخاوت کا ہے فیضِ بے کراں
ورنہ میں اور یہ سوادِ رنگ و رعنائی کہاں

گرد کا چہرہ اُجالا، خُرد کو توقیر دی
تُو نے اس جلتے ہوئے صحرا کو جوئے شیر دی

آج بھی روشن ہے تیری ضَو کی لَو انساں میں
کشتیاں تُو ڈوبنے دیتا نہیں طوفان میں

اب بھی وہ نغمہ مرے گیتوں مرے خوابوں میں ہے
جس کی چاندی قبلۂ اوّل کی محرابوں میں ہے

رُوح کی یہ پیاس لفظوں میں کروں کیسے بیاں
کوئی مجبوری تو ہے جو کھینچ لاتی ہے یہاں

لمحہ لمحہ جسم میں یہ رقصِ مہر و ماہ کا
اللہ اللہ یہ مسلسل لمس بیت اللہ کا

اے خدائے مہرباں تیرا کرم ہے اور میں
میرا دل ہے اور تُو ہے تیرا حرم ہے اور میں

بیتِ ربّ العالمیں کے پاک مینار و سلام
میری دنیا میں خدا کے گھر کی دیوار و سلام

مدینہ منورہ
۲۳ اگست ۱۹۸۵ء

قرطاسِ اعزاز

وزیر آغا

کے نام

سوانحی خاکہ

نام	وزیر آغا
والد	و۔ع۔خ (ہندوستانی فلسفے کے عالم)
تاریخ پیدائش	18/ مئی 1922ء
مقام پیدائش	وزیر کوٹ سرگودھا
تعلیم	ایم۔ اے (معاشیات) گورنمنٹ کالج، لاہور
	پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور
ادبی مشاغل	1961ء میں "ادبی دنیا" لاہور شریک مدیر ہوئے
	1966ء میں "اوراق" کے مدیر ہوئے اور تاحال ہیں
پیشہ	زمینداری

○

(الف) تصانیف

شاعری

○

1)شام اور سائے (نظمیں)	جدید ناشرین لاہور	1964ء (دو ایڈیشن)
2)دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1969ء (ایک ایڈیشن)
3)غزلیں	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1973ء (چار ایڈیشن)
4)نردبان (نظمیں)	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1979ء (ایک ایڈیشن)
5)آدھی صدی کے بعد (طویل نظم)	مکتبہ فکر و خیال	1981ء (پانچ ایڈیشن)
6)گھاس میں تتلیاں (نظمیں)	مکتبہ فکر و خیال	1985ء (ایک ایڈیشن)
7)اک کتھا انوکھی (نظمیں اور غزلیں)	مکتبہ فکر و خیال	1990ء (ایک ایڈیشن)
8)چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات)	مکتبہ فکر و خیال	1991ء (ایک ایڈیشن)

○

انشائیہ

○

1)خیال پارے	اکادمی پنجاب لاہور	1961ء (دو ایڈیشن)

2)چوری سے یاری تک	جدید ناشرین لاہور	1966ء(دو ایڈیشن)
3)دوسرا کنارا	مکتبہ فکر و خیال	1982ء(دو ایڈیشن)
4)سمندر اگر میرے اندر گرے	مکتبہ فکر و خیال	1989ء(ایک ایڈیشن)

○

تنقید

○

1)اردو ادب میں طنز و مزاح (پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسس)	اکادمی پنجاب	1959ء(12 ایڈیشن)
2)نظم جدید کی کروٹیں	اکادمی پنجاب	1963ء(تین ایڈیشن)
3)اردو شاعری کا مزاج	جدید ناشرین لاہور	1965ء(آٹھ ایڈیشن)
4)تنقید اور احتساب	جدید ناشرین لاہور	1968ء(ایک ایڈیشن)
5)نئے مقالات	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1972ء(ایک ایڈیشن)
6)تصورات عشق و خرد، اقبال کی نظر میں	اقبال اکیڈمی لاہور	1977ء(تین ایڈیشن)
7)نئے تناظر	اردو رائٹرس گلڈ الٰہ آباد	1979ء(دو ایڈیشن)
8)تنقید اور مجلسی تنقید	آئینہ ادب لاہور	1981ء(تین ایڈیشن)
9)دائرے اور لکیریں	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1986ء(ایک ایڈیشن)
10)تنقید اور جدید اردو تنقید	انجمن ترقی اردو کراچی	1989ء(دو ایڈیشن)
11)انشائیہ کے خدوخال	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1990ء(دو ایڈیشن)
12)مجید امجد کی داستان محبت	آواز جرس پبلیکیشنز لاہور	1991ء
13)ساختیات اور سائنس	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1991ء
14)دستک اس دروازہ پر	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1993ء
15)چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات)	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1992ء

○

متفرق

○

1)مسرت کی تلاش (مضامین)	اکادمی پنجاب لاہور	1953ء
2)تخلیقی عمل (نظریہ)	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1970ء
3)شام دوستاں آباد (مضامین)	مکتبہ عالیہ لاہور	1974ء
4)شام کی منڈیر سے (خود نوشت سوانح)	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1986ء

○

(ب) تالیفات

○

1)1958ء کی نظمیں	اکادمی پنجاب لاہور	

2)1959ء کی نظمیں	اکادمی پنجاب لاہور	
3)1960ء کی نظمیں	اکادمی پنجاب لاہور	
4)1961ء کی نظمیں	اکادمی پنجاب لاہور	
5)عبدالرحمن چغتائی۔ شخصیت اور فن	مجلس ترقی ادب لاہور	
6)مولانا صلاح الدین احمد۔ شخصیت اور فن	انجمن ترقی اردو کراچی	
7)انتخاب جدید (نظم) حصہ دوم	انجمن ترقی اردو کراچی	

○

(ج) دوسری زبانوں میں تراجم

○

1)SELECTED POEMS (انگریزی) (OF Waziragha)	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	1978ء
2)Half a century later (انگریزی)	مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور	1989ء
3)آدھی صدی کے بعد (ہندی)	پبلشر ش۔ک۔ نظام انڈیا	1983ء
4)بارھواں کھلاڑی (پنجابی)	مترجم و پبلشر موہن لال انڈیا	1985ء
5)اردو شاعری کا مزاج (ہندی)	سیمانت پرکاشن انڈیا	1987ء
6)Chunvian Nazman (سرائیکی)	جدید پبلیکیشنز خانپور	1980ء
7)A Tale so strange (انگریزی)	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1991ء

○

(د)وزیر آغا کے فکر و فن پر لکھی گئی کتابیں اور رسائل

○

1)وزیر آغا۔ ایک مطالعہ ڈاکٹر انور سدید	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1982ء
2)شام کا سورج ڈاکٹر انور سدید	مکتبہ فکر و خیال لاہور	1989ء
3)الزبیر (وزیر آغا نمبر) شہاب دہلوی	اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور	
4)آواز جرس (وزیر آغا نمبر) مظفر حسین افتخار راہی	آواز جرس پبلیکیشنز لاہور	
5)تخلیقی ادب مرتبہ مشفق خواجہ --- ایک خصوصی گوشہ		
6)"Skylark International"	(انگریزی) انڈیا۔ وزیر آغا نمبر	
7)معاصرین کی نظر میں مرتبہ سجاد نقوی		
8)دن ڈھل چکا تھا (وزیر آغا کی نظمیں)	ناصر عباس نیر	

O

(ج) وزیر آغا کی تخلیقات پر مرتب کتب

O

1)وزیر آغا کے دیباچے	مرتبہ	ڈاکٹر سید احسن زیدی
2)پہلا ورق (اوراق کے اداریے)	مرتبہ	حیدر قریشی' راغب شکیب
3)وزیر آغا کے خطوط	مرتبہ	ڈاکٹر انور سدید
4)مکالمات (وزیر آغا سے)	مرتبہ	ڈاکٹر انور سدید

O

(د) وزیر آغا پر جامعات میں تحقیقی کام

O

1)بہار یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالواسع کی نگرانی میں
پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالہ — وزیر آغا کا فن

2)وزیر آغا کا اسلوب نثر	پنجاب یونیورسٹی	عباس نیر
3)وزیر آغا کی شاعری	پنجاب یونیورسٹی	محمد اسلم
4)وزیر آغا کی تنقید	پنجاب یونیورسٹی	اسم محمد
5)وزیر آغا کی اقبال شناسی	اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور	مس رضوی
6)وزیر آغا کی انشائیہ نگاری	اسلامیہ یونیورسٹی پشاور	ارم ضیا
7)وزیر آغا کی انشائیہ نگاری	اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور	

(بحوالہ چوری سے یاری تک)

8)مارواڑی کالج بھاگلپور میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ — وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

9)پٹنہ میں وہاب اشرفی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ — وزیر آغا کی تنقید

10)وزیر آغا کی تنقید جے پور یونیورسٹی بھارت ایم فل کا مقالہ

آج سے نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ میں جب گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد لاہور ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو بالکل گھبرا گیا۔ ان دنوں جھنگ کی کل آبادی زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی جب کہ لاہور سات آٹھ لاکھ افراد کا ایک جنگل تھا آج اس بات کا تصور کر کے ہنسی آتی ہے کیونکہ اب تو چھوٹے چھوٹے شہروں کی آبادی بھی پانچ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے اور لاہور؟ ------ لاہور تو اب شاید پچاس لاکھ کے ہندسے کو مس کر رہا ہے یا اسے پار کر چکا ہے مگر ان دنوں لاہور محض سات آٹھ کے پھیر میں تھا۔ پھر بھی وہ آبادی کا ایک جنگل نظر آتا تھا یا کم از کم مجھے وہ ایک جنگل دکھائی دیتا تھا۔ سڑکوں پر زیادہ تر تانگے اور سائیکل رواں دواں رہتے یا پھر کبھی کبھار کوئی کار یا بس نظر آجاتی۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ پٹرول راشن میں ملتا تھا لہٰذا کاروں اور بسوں کی کارکردگی متاثر ہوئی تھی۔ لاہور کی سرکلر روڈ کو پار کر کے کچھ ہی دور جانے پر دیہاتی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ مال روڈ چڑھتے گھونٹ ہی واقع تھی اور وہاں تک جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس سڑک پر زیادہ تر گورے ہی مصروف خرام ہوتے۔ وہیں اکے ریسٹورنٹ تھے جن میں وہ شراب پیتے اور گئی رات تک رقص کرتے تھے۔ مال روڈ پر دو سینما ہاؤس تھے ------ ریگل اور پلازا! دونوں میں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتیں (یہ روایت آج تک باقی ہے) میں جب گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد لاہور کے شب و روز سے ہم آہنگ ہو گیا تو مہینے میں ایک یا دو بار ڈرتے ڈرتے ریگل یا پلازا کی چند آنے والی کلاس میں اپنے دیسی بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھتا۔ باقی سینما گوروں سے پر ہوتا۔ سینما ہال کی مدھم روشنی میں وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور ہال میں ویٹر بھوتوں کی طرح مشروبات تقسیم کرتے نظر آتے۔

مگر بالائی سطح کی اس بے رونقی کے نیچے ایک طوفان مرتب ہو رہا تھا۔ یہ 1940-43ء کا زمانہ تھا جب میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تو مجھے جلدی اس بات کا احساس ہوا کہ پورے کالج کی فضا میں آویزش کے تین روپ نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک روپ سیاسی انداز فکر کا زائیدہ تھا۔ انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی میں ایک نئے بعد کا اضافہ ہو گیا تھا یعنی آزادی اب واقعتاً نظر آنے لگی تھی اور اس کی ایک جھلک پاتے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی آزادی خطرے میں محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مغائرت کی خلیج سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا اثر کالجوں کی فضا پر بھی مرتسم ہوا تھا گو جہاں تک گورنمنٹ کالج لاہور کا تعلق ہے' اس کی مضبوط روایات نے اس آویزش کو ایک بڑی حد تک دبا رکھا تھا۔ یوں بھی ان دنوں سیاسی پارٹیاں تعلیمی اداروں میں دخل اندازی نہیں کرتی تھیں۔ اور کلاشنکوف کلچر کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ پھر بھی' جیسا کہ میں نے کہا' زیر سطح آویزش کے آثار موجود تھے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کو

THE BEST EDUCATIONAL INSTITUTION
EAST OF SUEZ

کا خطاب مل چکا تھا اور پورے ہندوستان کا جوہر قابل اس کالج میں ہمہ وقت نظر آتا تھا۔ تعلیمی معیار کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ میں جو گورنمنٹ کالج جھنگ میں اپنی کلاس کا بہترین طالب علم تصور ہوتا تھا' جب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا تو کلاس میں میرا رول نمبر 56 تھا۔ گویا 55 طالب علم مجھ سے تعلیمی لحاظ سے بہتر تھے۔ کلاس کے تین سیکشن تھے۔ میں خوش قسمت تھا کہ مجھے پہلے سیکشن میں جگہ ملی اور یوں مجھے ملک کے بہترین ابھرتے ہوئے اذہان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ یہ طالب علم باتیں کرتے ہوئے ایک غیر جذباتی معروضی انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔ جوش جوانی کے تحت آوازیں تو کراری ہوتیں لیکن گفتگو میں رکھ رکھاؤ اور

دوسرے کی بات کو سننے اور سمجھنے کا انداز نمایاں ہوتا۔ خالص اکیڈیمک فضا تھی۔ اس فضا میں ہم ملکی صورت حال پر بحث کرتے مسلمان طلباء اپنے ہندو اور سکھ ساتھیوں سے مختلف انداز میں سوچتے اور اپنے مستقبل کے بارے میں خدشات کا اظہار کرتے۔ البتہ کالج میں ہونے والے DEBATES میں سیاست کا موضوع ٹیبو TABOO تھا۔

آویزش کا دوسرا روپ طبقاتی فرق کا زائیدہ تھا۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک طرف تو راجوں مہاراجوں کے سپوت اور بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے فرزندان ارجمند تعلیم پاتے تھے اور دوسری طرف میری طرح کے وہ طالب علم تھے جو درمیانے یا نچلے درجے کے طبقات سے آئے تھے۔ لہٰذا لباس کی تراش خراش نیز زاویہ نگاہ اور انداز گفتگو ان سب کے معاملے میں دو قومی نظریے کا ثبوت جابجا دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک قوم HAVES اور دوسری HAVENOTS کی تھی۔ چنانچہ طلباء میں اکثر و بیشتر طبقاتی فرق اور استحصالی رویے پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے طلباء کی زبان تیز اور مطالعہ وسیع تھا اور وہ بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ لہٰذا کالج کی فضا پر وہ چھائے رہتے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ بعض اونچے طبقے کے نوجوان بھی نظریاتی اعتبار سے لفٹسٹ تھے۔ عجیب سی صورت حال تھی!

آویزش کا تیسرا روپ دراصل اس کے دوسرے روپ کی توسیع تھا مگر بائیں یا دائیں بازو کے نقطۂ نظر سے لازمی طور پر منسلک نہیں تھا۔ چنانچہ ایک طبقہ جس میں دائیں اور بائیں' دونوں بازوؤں کے طلباء شامل تھے' نظریے کے اعتبار سے ATHIEST یا ACNOSTIC تھا اور دوسرا مذہب' ثقافت' اور فنون لطیفہ کے حوالے سے خدا کے وجود کا قائل تھا۔ میرا تعلق اسی دوسرے طبقے سے تھا اور میں ATHIESTS کے دلائل کو بہت سطحی سمجھتا تھا۔ میرے رویے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے خاندان میں تصوف کی ایک مضبوط روایت موجود تھی جس کی میں خوشہ چینی کرتا رہا تھا۔ دوسری یہ کہ میں فنون لطیفہ کے ذریعے "حقیقت" کو قریب سے محسوس کرنے کا قائل تھا۔ بالخصوص شاعری سے میں بہت متاثر تھا اور مجھے بہت سے اردو اور انگریزی زبان کے شعراء کی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ میں خود انگریزی میں شعر بھی کہتا تھا اور بعد ازاں اردو میں بھی لکھنے لگا تھا مگر انہیں "راوی" میں بغرض اشاعت روانہ نہیں کرتا تھا۔ ان دنوں محمد اجمل (اب ڈاکٹر محمد اجمل) راوی کے ایڈیٹر تھے۔ بہت مقبول تھے اور انہوں نے راوی کے معیار کو خاصا بلند کر دیا تھا۔ میں انہیں بس دور دور ہی سے دیکھتا رہا۔ کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اور ہوئی تو کالج سے فارغ ہونے کے کم و بیش بیس برس بعد!

جب میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تو ڈنی کلف پرنسپل تھے لیکن اگلے ہی برس ان کی جگہ مسٹر سوندھی پرنسپل مقرر ہوئے اور پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہی وہ کالج میں ہردلعزیز ہو گئے۔ وثوق کے ساتھ تو میں کہہ نہیں سکتا مگر میرا خیال ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج کے پہلے دیسی پرنسپل تھے۔ وہ طلباء پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنے کے خلاف تھے۔ انہیں کھل کر باتیں کرنے کے مواقع مہیا کرنے اور DEBATES میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی تلقین کرتے۔ البتہ ایک واقعہ ایسا بھی ہوا کہ طلباء پر ان کے اعتماد کو سخت دھچکا لگا۔ ہوا یہ کہ پرنسپل صاحب نے حکم جاری کیا کہ کالج لائبریری میں کتابوں کی الماریوں کو مقفل نہ کیا جائے اور طلباء کو اجازت دی کہ وہ اپنی مرضی سے خود ہی الماری میں سے کتاب نکالیں اور لائبریری کے اندر بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنے کے بعد خود ہی کتاب واپس الماری میں رکھ دیں۔ دو تین ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر جب کتابوں کی گنتی ہوئی تو معلوم ہوا کہ لائبریری سے کئی ہزار کتابیں غائب تھیں گویا اپنی قدیم روایت' ڈسپلن اور ایک مضبوط اکیڈیمک فضا کے باوصف طلبا کا جبلی رجحان بدلا نہ جا سکا تھا۔ اس بات پر پرنسپل سوندھی کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔

پرنسپل سوندھی کے علاوہ کچھ اور اساتذہ بھی گورنمنٹ کالج میں بہت مقبول تھے۔ مثلاً پروفیسر سراج جو انگریزی پڑھاتے تھے اور پروفیسر کھنہ جو تاریخ کے استاد تھے اور پروفیسر ڈیگرا اور سب سے زیادہ پروفیسر غلام مصطفیٰ تبسم جن کا کالج میں بہت شہرہ تھا۔ انہیں ایک طرح کی کرشماتی شخصیت (CHARISMATIC PERSONALITY) سمجھا جاتا تھا۔ چہ عرصے وہ گزرتے طلبا لپک کر ان کا راستہ روک لیتے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ چونکہ میں نے فارسی کا مضمون نہیں لیا تھا لہٰذا صوفی تبسم صاحب سے پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ جب کالج سے فارغ ہونے کے کافی عرصہ بعد میں اردو ادب سے منسلک ہوا تو پھر صوفی صاحب سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں رہتیں۔ اور مجھے انہیں مل کر ہر بار افسوس ہوتا کہ میں کالج کے ایام میں ان سے استفادہ کیوں نہ کر سکا۔

کالج میں مخلوط تعلیم ضرور تھی لیکن لڑکیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بمشکل پندرہ بیس لڑکیاں ہوں گی۔ اس معاملے میں بھی دو قومی نظریہ بہت فعال تھا یعنی یہ کہ لڑکیاں' لڑکوں سے بہت کم گفتگو کرتیں بلکہ ان سے دور دور ہی رہتیں۔ ان کا کمرہ سیڑھیوں کے قریب تھا۔ ان سیڑھیوں پر لڑکوں کا ہجوم رہتا لیکن میں نے کبھی کسی لڑکے کو بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ بہت سے طلباء تو سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بوکھلا جاتے۔ مگر اس کا ردعمل یوں ہوتا کہ

وہ کلاس کے ڈیسکوں پر بعض لڑکیوں کے نام چاقو سے رقم کر دیتے۔

لیکن کالج کا مرکزی نقطہ کالج نہیں بلکہ نیو ہوسٹل تھا۔ کالج میں تو بیشتر لڑکے محض نشستند و شنیدند کے مراحل سے گزر کر بکھر جاتے لیکن نیو ہوسٹل میں وہ دن رات اکٹھے رہتے۔ وہیں پائیدار قسم کی دوستیاں جنم لیتیں اور وہیں دراصل تعلیمی قید و بند سے باہر نکل کر "علم" کی تحصیل کے مواقع پیدا ہوتے۔ چنانچہ نیو ہوسٹل میں وہ لڑکے زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے نہیں جاتے تھے جو "پڑھاکو" قسم کے تھے اور دن رات محض کورس کی کتابیں رٹتے رہتے بلکہ وہ جو انگریزی اخبار پڑھتے' انگریزی فلمیں دیکھتے یا انگریزی ناولوں کا مطالعہ کرتے۔ یہ لڑکے انگریزی فر فر بولتے' تقاریر کے مقابلوں میں بھی بہت نمایاں ہوتے اور ان میں سے بعض تو بہت اچھے کھلاڑی بھی ہوتے۔۔۔ میری بدقسمتی کہ مجھے نیو ہوسٹل میں رہنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ غالباً خرچ بچانے کے لئے مجھے میرے والد نے موچی دروازے میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا دیا تھا۔ میں وہاں سے ہر روز سائیکل پر سوار ہو کر کالج آتا اور سہ پہر کے قریب واپس چلا جاتا۔ لہٰذا گو نیو ہوسٹل جانے کا اکثر اتفاق ہوتا لیکن میں وہاں کے طلبا میں مکمل مل نہ سکا۔ نتیجہ یہ کہ میں "پڑھاکو" قسم کے طلبا ہی میں شامل رہا۔

میں نے بی۔ اے میں تاریخ اور معاشیات کے مضامین لئے تھے لیکن اردو بطور اختیاری مضمون پڑھتا تھا۔ اب مجھے نام تو یاد نہیں ہے لیکن ان کا چہرہ اور وضع قطع مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دیسی لباس' سفید خوبصورت داڑھی' بہت رواں اور مترنم زبان! بولتے تو یوں لگتا جیسے موتی بکھیر رہے ہیں۔ نہایت مرنجاں مرنج انسان تھے۔ طلبا ان کی کلاس میں کبھی ناغہ نہ کرتے حالانکہ اردو آپشنل کی بے قدری کا یہ عالم تھا کہ اس میں حاصل کئے گئے نمبر کل یعنی AGGREGATE میں شامل ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس ناغہ نہ کرنے کی وجہ اردو سے محبت نہیں تھی بلکہ مولوی صاحب سے چھیڑ چھاڑ تھی۔ مولوی صاحب بہت اچھے استاد تھے لیکن بے حد شریف اور شرمیلے! بدقسمتی سے انہیں غالب ایسے شاعر کا کلام پڑھانے پر مامور کیا گیا تھا اور مولوی صاحب کو قدم قدم پر بہت پریشانی کا سامنا ہوتا۔ مثلاً جب وہ غالب کا اس قسم کا شعر ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پڑھاتے ہوئے لفظ "بوسہ" کو حذف کر دیتے تو پورے کلاس روم میں سیٹیاں اور نعرے گونجنے لگتے مثلاً یہ کہ مولوی جی "بوسہ" کا لفظ کہہ ڈالئے' شرمایئے نہیں اور مولوی صاحب تھے کہ واقعتاً شرما جاتے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ تب وہ خود کو سنبھال کر مسکراتے اور "نالائقو شرم کرو" کے الفاظ ایسے میٹھے انداز میں کہتے کہ ساری کلاس زعفران زار میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں دیکھتا کہ مولوی صاحب کے رکھ رکھاؤ کے باوجود یا شاید اس رکھ رکھاؤ کے باعث طلبا ان سے بہت محبت کرتے تھے۔

جہاں طلباء مولوی صاحب سے بے تکلف تھے وہاں صوفی تبسم طلباء سے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے مجھے ان کی محفلوں میں بیٹھنے کا تو اتفاق نہ ہو سکا لیکن یہی سنا کہ ان کی محفل میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور صوفی صاحب لفظ "صوفی" کی تحریف بن کر ایسی ایسی نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ عمروں کا بعد ختم ہو جاتا ہے۔ محفل کے شرکاء استاد اور شاگرد کے رشتے سے منقطع ہو کر دوستی اور رفاقت کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔

میں نے بی۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور پھر ایم۔ اے (معاشیات) کے لئے یونیورسٹی ہال سے ملحقہ کمروں میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ مگر میں طالب علم گورنمنٹ کالج ہی کا رہا۔ ایم۔ اے معاشیات میں ہمیں ڈاکٹر بیمن' پروفیسر ملہوترا اور ڈاکٹر اختر پڑھاتے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت وہیں گزرتا لیکن گورنمنٹ کالج میرا ALMA MATER تھا لہٰذا وقت ملتے ہی میں اپنے کالج میں آجاتا اور کچھ نہیں تو کالج کے عین سامنے وسیع لان میں کسی بنچ پر بیٹھ کر اونگھتا رہتا۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے میں مادر مہربان کی گود میں سر رکھے آرام کر رہا ہوں۔

جدید و قدیم فارسی ادب کے مختلف پہلوؤں پر معروف شاعر اور استاد انور مسعود کے خیال انگیز مقالات کا مجموعہ

"فارسی ادب کے چند گوشے"

جن کو مصنف کی خوش مزاجی' خوش نظری اور خوش فکری نے حد درجہ قابل مطالعہ بنا دیا ہے

دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت گیٹ آپ۔ قیمت 100 روپے

ملنے کا پتہ

عاقب پبلشرز 403 آئی نائن ون اسلام آباد

براہ راست

ادبی طالب علم ہونے کے ناطے عصری دور ادب کو ہم خوش قسمت دور تصور کرتے ہیں آج کے قاری کو تخلیقی ادب کے ساتھ تحقیق و تنقید کے حوالے سے ایسی بلندپایہ شخصیات کی رہبری و رہنمائی حاصل ہے--- کہ جن کی وسعت نگاہ گزرے ہوئے کل کی رفعتیں سنبھالنے کے ساتھ آنے والے کل کی عظمتیں بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی تڑپ رکھتی ہے ہمارا دل کڑھتا جتا اور کبھی اس بات پر احتجاج کرتا ہے کہ ہم نے دیو مالائی طرز پر گفتنی ناگفتنی کے جال ان محترم شخصیات کے گرد کیوں تانے ہوئے ہیں--- زیر نظر گوشے کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے جس شفیقانہ برتاؤ سے ہمیں نوازا اس کے سبب ہمارے ذہن میں پلنے والے بہت سے اندیشے وسوسے اور واہمے رفع ہو چکے ہیں اور ہم اردو ادب کے گھنے سایہ دار شانت درخت کی ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے ساتھ سورج کی مدھر کرنوں سے بھی فیضیاب ہو رہے ہیں---- اس سرمستی و سرشاری کی قیمت فقط---- بےلوثی و بے غرضی ہے۔

گلزار جاوید

△ ادبی کشتی کے سوار کب اور کیونکر بنے؟

▲ میں کالج کے ایام میں شعر فہمی اور شعر گوئی کی طرف راغب ہوا۔ انگریزی اور اردو' دونوں زبانوں میں لکھا مگر چھپوایا نہیں! بعد ازاں یہ سارا کلام تلف کر دیا کالج کے بعد نصرت آرا نصرت کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا نصیر آغا کے فرضی نام سے مقالات لکھے مگر 1948ء کے آخری دنوں میں اپنے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اپنے نام سے میرا پہلا مضمون تھا "محبت کا تدریجی ارتقا" جو ادبی دنیا کے شمارہ دسمبر 1948ء میں شائع ہوا "کب" کا جواب میں نے دے دیا "کیونکر" کا کیا جواب دوں!

△ جینئس تخلیق کار کا تصور کیا ہے؟

▲ تخلیق کار ماضی اور مستقبل' روایت اور تجربہ کے سنگم پر جنم لیتا ہے اس کا ایک قدم ماضی کی انگنائی میں ہوتا ہے اور دوسرا مستقبل کے رن وے پر۔ وہ نہ صرف نسلی یادوں سے بلکہ منفس خوابوں سے بھی لہو کشید کرتا ہے وہ حال کے

ڈولتے ہوئے لمحہ کی نوک پر رک کر تخلیق کرتا ہے۔ یہ مقام بے زمانی کا حامل ہوتا ہے۔ گویا زمانوں سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے زمانی کے تجربے سے گزرنے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ اس کا تخلیقی عمل اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ وہ جس خیال، شے یا لفظ کو چھوتا ہے وہ لو دینے لگتا ہے۔

△ انشائیہ نگاری تخلیقی فن کے زمرے میں آتی ہے کیا؟

▲ انشائیہ نگاری یقیناً تخلیقی فن کے زمرے میں آتی ہے۔ انشائیہ کا کمال یہ ہے کہ وہ غیر افسانوی اور غیر شاعرانہ نثر کو جو عام طور سے اخباری، سائنسی یا علمی ضرورتوں کے لئے کارآمد ہے، تخلیقی سطح پر لے آتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جہاں عام نثر فقط افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے وہاں انشائیہ کی نثر عرفان ذات اور جمالیاتی حظ کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ انشائیے کا کثیرالمعنیاتی پیکر شعر اور افسانے سے مشابہ ہے نہ کہ نثر کی ان صورتوں سے جو معنی کی ترسیل میں ابہام کی کارفرمائی کو مسترد کرتی ہیں۔

△ آزاد شاعری اور طویل نظمیں لکھنے سے نثر نگاروں کی حق تلفی نہیں ہو رہی کیا؟

▲ اسی سوال کو آپ الٹ کر یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ کیا انشائیہ اور افسانہ کی مقبولیت سے شاعری کی حق تلفی نہیں ہو رہی؟ دراصل حق تلفی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں کا اپنا اپنا میدان اور اپنا اپنا طریق کار ہے بعض اوقات ایک ہی فن کار بیک وقت نثر نگار بھی ہوتا ہے اور شاعر بھی۔ علاوہ ازیں شاعری اور نثر ایک دوسری پر اثرات بھی مرتسم کرتی ہیں۔ اچھی شاعری سہل ممتنع کی سطح پر آکر Spoken Language کا روپ دھار لیتی ہے اور اچھی نثر میں شعری عناصر گھل مل جاتے ہیں۔ دونوں میں کسی بھی قسم کی قبائلی دشمنی نہیں ہے۔

△ تخلیق کار کی معاشی حیثیت کا اس کے فن پر کیا اثر پڑتا ہے؟

▲ تخلیق کار کی معاشی حیثیت کا اس کے فن پر کوئی اثر مرتسم نہیں ہوتا۔ بہت سے مفلوک الحال فنکاروں نے بے پر وبال قسم کا ادب تخلیق کیا اور بہت سے خوشحال ادیب، خوشحال خنک بن کر چکے اسی طرح بعض خوش حال ادیبوں نے ایسا ادب تخلیق کیا جس کی ادبی قدر و قیمت بالکل معمولی تھی اور بعض نادار فن کاروں نے اعلیٰ پائے کی تخلیقات پیش کیں لہٰذا معاشی حیثیت ادب کے معاملے میں کوئی میزان نہیں ہے۔ کسی نظریے، اعتقاد یا نسلی رویے کو بھی ہم میزان قرار نہیں دے سکتے تخلیق کار کی وہی قوت، اس کے ہاں تجربات کی فراوانی، زندگی کی معمولی کروٹوں تک کو شدت سے محسوس کرنے کا رویہ اور پھر لفظ کو تخلیقی طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت ــــــ فن پر ان سب کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں مگر فنکار کا غریب یا امیر ہونا، دائیں بازو سے منسلک ہونا یا بائیں بازو سے، کالا ہونا یا سفید یا کسی بھی مذہب یا فرقے سے متعلق ہونا۔ ان باتوں کا تخلیق کار کی کامیابی یا ناکامی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

△ تنقید نگار بنیادی طور پر State Forward ہے جبکہ تخلیق کار نرم خو محبت و اخوت اور مساوات کا پیامبر ہوتا ہے۔ یہ دورنگی شخصیت کو مجروح کرنے کا سبب نہیں بنتی؟

▲ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ تخلیق کار تو محبت اخوت اور مساوات کا پیامبر ہوتا ہے جب کہ نقاد نہیں۔ تنقید کے کئی روپ ہیں۔ ایسی تنقید بھی ہے جس کے لئے تصنیف ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کا رویہ تیز اور متشدد ہوتا ہے اور ایسی تنقید بھی جو تصنیف سے پیار کرتی ہے اور تصنیف پر سے نقاب ہٹاتے ہوئے اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ رہا مساوات کا مسئلہ یہ تو مصنف اور نقاد دونوں کا مشترکہ میدان ہے۔ دونوں مساوات کے حامی ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے دونوں کسی اور نظام کے قتیل ہوں۔ ویسے تخلیق کار اور تنقید نگار کو تخلیق کاری کے حوالے سے خالق اور صارف قرار دینا ایک ایسا مغالطہ ہے جو مغربی ادبیات میں اب موجود نہیں ہے جب کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ جو ابھی اٹھارویں صدی ہی میں رہ رہے ہیں اس قسم کی تفریق کو مانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تخلیق کاری کے عمل میں تین کردار حصہ لیتے ہیں۔ مصنف، تصنیف اور قاری (نقاد) تخلیق نام ہے ان تینوں کے ربط باہم کا ان کا رشتہ یہ نہیں ہے کہ مصنف نے اپنی تصنیف قاری یا نقاد کے سامنے رکھ دی تاکہ وہ اسے پرکھے بروئے کار لائے بلکہ یہ کہ تخلیقی عمل میں مصنف، تصنیف اور قاری برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ مصنف خود کو تصنیف میں انڈیل دیتا ہے جب کہ تصنیف کی ایک اپنی منفرد اور آزاد حیثیت بھی ہوتی ہے چنانچہ وجود میں آنے کے دوران تصنیف بعض اوقات خود مصنف کو اپنے تابع کر لیتی ہے۔ مراد یہ کہ مصنف تصنیف کو ایک خاص سمت میں لے جانا چاہتا ہے مگر تصنیف اپنا دامن چھڑا کر ایک اور سمت میں چلنے لگتی ہے۔ تصنیف کی اس مطلق العنانی اور اس کے اندر کے ساختیاتی نظام کو اب سب لوگ مانتے ہیں یہی حال قاری یا نقاد کا ہے۔ خود تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل کے دوران قاری کا رول بھی ادا کرتا ہے جب وہ اندر سے ابھرنے والے خیال یا لفظ یا زاویے کو بدل دیتا ہے۔ جہاں تک باہر کے قاری یا نقاد کا تعلق ہے تو وہ اپنے تنقیدی عمل سے تصنیف کو از سر نو تخلیق کرتا ہے۔ ہر زمانہ بجائے خود ایک نقاد ہے۔ اگر یہ نقاد باقی نہ رہے تو تصنیف اپنے زمانے کے حصار سے باہر ہی نہ آسکے۔ لہٰذا کہہ لیجئے کہ وہی تخلیق زندہ رہتی ہے جسے ہر زمانہ نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے۔

△ ایک تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ اردو ادب میں تنقید نام کی کوئی چیز نہیں یا آج کل لکھی جانے والی تنقید غیر جانب دار نہیں۔ بحیثیت نقاد آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟

▲ مجھے اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں ہے یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جو خود کو نابغۂ روزگار سمجھتے ہیں اور جنہیں یہ شکایت ہے کہ تنقید نے ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہے اردو تنقید نے پچھلی نصف صدی کے دوران بے پناہ ترقی کی ہے۔ لوگ باگ اخبارات میں چھپنے والے تقریباتی مضامین کو تنقید سمجھ لیتے ہیں جو صحیح رویہ نہیں ہے ایسے لوگ اگر واقعتاً اردو تنقید کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اردو کی اعلیٰ تنقید پڑھنی چاہیے۔ محض چائے خانوں میں تنقید اور یہ نگار کے بارے میں نشر ہونے والی جملہ بازی کو اہمیت دینے سے تو بات نہیں بنے گی۔

△ آپ ادیب کی کسی بھی دنیاوی نظریے سے وابستگی کو کس حد تک اور کتنے فیصد مناسب یا ضروری خیال کرتے ہیں؟

▲ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کسی بھی دنیاوی نظریے سے وابستگی کا تخلیقی ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اکثر اس قسم کی وابستگی تخلیق کار کے راستے میں ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ادیب کی وابستگی فن کے ساتھ ہو تو بات بنے گی۔ اصل چیز یہ ہے کہ تخلیق کار ساری وابستگیوں کو تج کر ایک لمحہ آزادی میں تخلیق کاری کی طرف متوجہ ہو۔ صرف اسی صورت میں وہ اپنے اندر بھی جھانک سکے گا اور زندگی کے پھیلتے ہوئے آفاق سے بھی آشنا ہو سکے گا لیکن اگر اس نے خود کو کسی بھی دنیاوی نظریے کے زندان میں مقید کر لیا تو وہ پمفلٹ تو بہت اچھے تخلیق کرے گا' ادب تخلیق نہیں کر پائے گا۔

△ ترقی پسندی کے مخالفین میں آپ کا شمار کرنے والے آپ کو دائیں بازو کا ادیب سمجھتے ہیں کیا آپ دائیں بائیں کی تفریق پر یقین رکھتے ہیں؟

▲ میں بار بار اپنے اس موقف کا اظہار کر چکا ہوں کہ ادیب کو دائیں یا بائیں بازو سے منسلک کرنا ناروا ہے۔ میرے نزدیک ایک سچے تخلیق کار کے دونوں بازو کٹے ہوتے ہیں جب کہ پانی کا مشکیزہ اس نے اپنے دانتوں میں پکڑ رکھا ہوتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کے سنگم پر کھڑا ہو کر تخلیق کرتا ہے اس کی ساری توجہ اپنے مشکیزے پر مرکوز ہوتی ہے جسے تیروں سے بچا کر منزل تک پہنچانا اس کی روح کا سب سے بڑا تقاضا قرار پاتا ہے۔ ایسا تخلیق کار "بازوؤں" کی بیساکھیوں کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ ویسے سیاسی سطح پر بھی پوری دنیا میں دائیں اور بائیں کی Polarization اب تیزی سے ختم ہو رہی ہے میری ناچیز رائے میں ادبا کو دائیں اور بائیں میں تقسیم کرنے کے بجائے "مصنفین" اور "محررین" میں تقسیم کرنا چاہیے۔ یعنی وہ ادیب جو تخلیقی توانائی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ جو پمفلٹ تیار کرتے ہیں۔

△ متحدہ ہندوستان میں ادبی گروہ بندیوں کی بنیاد دہلوی اور لکھنوی اسلوب بیان پر قائم تھی ---------- پاکستان میں موجود ادبی گروہ بندیوں کی بنیاد کیا ہے؟

▲ گروہ بندی ایک منفی عمل ہے جب کہ ادبی مکاتب فکر کا وجود میں آنا ایک مثبت بات ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے ادبی مکاتب دو مختلف رویوں کے علمبردار تھے۔ دہلی والے "خیال" کو اہمیت دیتے تھے اور لکھنؤ والے "لفظ" کو ----- ایک نے گل افشانی خیال کا مظاہرہ کیا دوسرے نے گل افشانی گفتار کا۔ دونوں مکاتب کے تحت ایسے تخلیق کار بھی پیدا ہوئے جن کے ہاں خیال اور گفتار کا خوبصورت سنجوگ تھا مگر بحیثیت مجموعی دہلی والوں نے خیال کی بھول بھلیوں میں سفر کیا اور لکھنؤ والوں نے لفظوں کے طوطے مینا بنائے۔ تاہم دونوں میں فرق ادبی نوعیت کا تھا۔ پاکستان میں زیادہ تر گروہ بندیاں مفادات کی اساس پر استوار ہیں۔ جگہ جگہ قبضہ گروپ پیدا ہو گئے ہیں۔ ان گروہوں کی زیر زمین اور بالائے زمین کارکردگی سے متنفر ہو کر ادبا کے ایک طبقہ نے گوشہ تنہائی اختیار کر لیا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو فی الوقت اچھا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔

△ تقسیم ہند نے اردو ادب پر کس قسم کے اثرات مرتب کئے۔ ہندوستان اور پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب کا آپ کس طرح موازنہ کریں گے؟

▲ اردو ادب پر برصغیر کی تقسیم کا سب سے اہم اثر یہ مرتب ہوا کہ اس کا مواد اور اسلوب دونوں متحرک ہو گئے۔ اتنے بڑے پیمانے پر انسانوں کی نقل مکانی سے نہ صرف "بے گھر" ہونے کا احساس ابھرا' نہ صرف قدروں کی پامالی کا منظر سامنے آیا بلکہ صدیوں کے سوئے ہوئے معاشرے کی بھی آنکھ کھل گئی۔ جس طرح پرانی اردو فلموں کے ٹھہرے ہوئے انداز کے مقابلے میں نئی فلموں کے تحرک کو باآسانی نشان زد کیا جا سکتا ہے اسی طرح تقسیم کے بعد کے ادب کے مزاج میں جو تبدیلی آئی اسے بھی بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے دراصل ہر بحران کے بعد چاہے وہ جنگ کی صورت میں ہو یا طوائف الملوکی کی صورت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے اردو ادب کو ایک حد تک متحرک کیا مگر تقسیم کے موقع پر ہونے والے فسادات اور لاکھوں انسانوں کی ہجرت نے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔ تقسیم کے فوراً بعد فسادات کے موضوع پر خاصا ادب تخلیق ہوا۔ اس وقت تک ابھی ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرا ہندوستان اور پاکستان کے حالات بدلتے گئے اور اس تبدیلی کے اثرات ادب پر بھی مرتسم ہونے لگے۔ ابھی یہ اثرات زیادہ واضح نہیں ہیں لیکن پچاس سو برس کے بعد

بہت واضح ہو جائیں گے مثلاً ہندوستان میں جمہوریت کے فروغ نے کھل کر بات کرنے کی روش کو ابھارا جب کہ پاکستان میں مارشل لاء کے بار بار نفاذ نے اخفا کے عمل کو مقبول بنایا۔ دونوں ملکوں کے اردو ادب پر اس کے اثرات مرتسم ہوئے اسی طرح ہندوستان والوں کے ثقافتی اور تاریخی تسلسل میں کوئی شے رخنہ انداز نہ ہوئی مگر پاکستان میں جڑوں کی تلاش کا مسئلہ ابھر آیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے از سرنو اپنے ماضی کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کے اردو ادب پر (تنقید سمیت) اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ دونوں ملکوں کی اردو تخلیقات میں لہجے کا کچھ فرق بھی نمودار ہوا۔ اور لفظیات کے سلسلے میں بھی کچھ فرق پڑا۔ مگر یہ فرق ابھی موہوم ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وقت کی گزران کے ساتھ ساتھ یہ بھی نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ایک فطری عمل بھی ہے اگر انگلستان اور امریکہ میں تخلیق ہونے والی انگریزی زبان کی تصانیف میں فرق در آیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آگے چل کر پاکستان اور ہندوستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب میں بھی فرق نمودار نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک خوش آئند بات ہوگی۔ کسی بھی زبان کے ادب میں نئے لہجوں اور زاویوں کی نمود کو ہمیشہ سراہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ پوری دنیا میں ایک "اردو برادری" جنم لے رہی ہے۔ اس برادری میں ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادبا کے علاوہ یورپ' کنیڈا' امریکہ' اور خلیجی ممالک کے ادبا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا مآل کار علاقائی اثرات کے تحت اردو ادب کے بھی کئی رنگ ابھریں گے مگر یہ سب کچھ اردو ادب کے بڑے دائرے کے اندر رونما ہوگا۔

△ آپ کے یہاں اردو کے ساتھ انگریزی اور ہندی رنگ زیادہ نمایاں نظر آنے کی وجہ کیا ہے؟

▲ میری شاعری بالخصوص نظم میں ہندی الفاظ کی آمیزش نظر آتی ہے۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو اس زمانے میں اردو زبان کے دو انداز رائج تھے۔ ایک فارسی آمیز روپ جسے علامہ اقبال اور ان کے بعد ن۔ م۔ راشد نے اختیار کیا۔ دوسرا ہندی آمیز روپ جسے میراجی اور فراق' ان کے بعد مجید امجد' قیوم نظر اور دوسرے شعرا نے اپنایا۔ میرا جھکاؤ میراجی اور فراق کے اسلوب کی طرف تھا اور اسی لئے میری نظموں میں ہندی الفاظ در آئے۔ تاہم پاکستان میں دھیرے دھیرے ہندی الفاظ کا استعمال کم ہوتا چلا گیا۔ البتہ کچھ شعرا نے اسے باقی رکھا۔ میں انہیں شعرا میں سے ہوں۔ مگر میرے ہاں ہندی الفاظ کی بے محابا آمیزش نہیں ہے جہاں کہیں میں نے محسوس کیا کہ ہندی لفظ کے استعمال سے خیال یا تشبیہ یا انداز کی سندرتا بڑھے گی' میں نے اسے استعمال کیا۔ ویسے میرا موقف یہ ہے کہ مشکل لفظی تراکیب اور بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے چاہے وہ فارسی کے ہوں یا ہندی کے گریز اختیار کرکے شعری زبان کو گفتگو کی سطح پر لایا جائے۔ جہاں تک انگریزی الفاظ کا تعلق ہے تو وہ میں نے نظم میں بہت کم استعمال کئے ہیں۔ البتہ مغرب میں جدید نظم کے رنگ اور پیکر سازی کے سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی ہے میں نے اسے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ میرا یہ موقف ہے کہ جدید اردو نظم کو مغرب کے شعری دھاروں سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے ثقافتی ورثے' اپنی زبان کی مخصوص ساخت اور اپنے موضوعات کو جدیدیت کی خاطر قربان کردے۔ صنوبر کو بہرحال پابہ گل ضرور ہونا چاہیئے ورنہ وہ مرجھا جائے گا۔

△ ادیب شاعر اور نقاد کے لئے اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ کس حد تک ضروری اور منافع بخش ہے؟

▲ اردو کے ادبا' شعرا اور ناقدین کے لئے انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ ان پر لازم ہے کہ ادب کے علاوہ علوم کا مطالعہ بھی کریں بالخصوص فلکیات' طبعیات' نفسیات' حیاتیات' ساختیات' علم الانسان اور انفرمیشن تھیوری کے مبادیات سے ان کا واقف ہونا ضروری ہے۔ علوم کے علاوہ فنون بالخصوص مصوری سنگتراشی اور موسیقی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے بھی واقف ہونا ضروری ہے ادیب کو In sight کے علاوہ Out look بھی درکار ہوتا ہے۔ مقدم الذکر ایک وہبی عمل ہے گو تربیت سے یہ مزید نکھر سنور سکتا ہے۔ مگر موخر الذکر ایک اکتسابی شے ہے جس کے لئے عمر بھر خاک چھاننا پڑتی ہے اردو ادبا کے ہاں (اور یہ بات مستثنیات کے تابع ہے) "ان سائٹ کی" تو فراوانی ہے مگر "آوٹ لک" کے معاملے میں وہ باقی دنیا کے ادیبوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں حد یہ کہ جب ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب چھپتی ہے جس میں ادب کی تفہیم کے لئے سائنسی علوم سے مدد لی گئی ہو تو ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں اور پھر مدافعتی انداز اختیار کرتے ہوئے سائنسی علوم نیز سائنسی علوم کو بنیاد بنا کر ادبی یا علمی مضامین لکھنے والوں کو ہدف طنز بناتے ہیں۔

△ اردو ادب کا عالمی ادب سے کس طرح موازنہ کریں گے پاکستان کے حوالے سے آپ کے ذہن میں چند نام ضرور ہوں گے جن کی تخلیقات کو آپ عالمی پایہ کا تصور کرتے ہوں؟

▲ نظم' افسانہ اور انشائیہ ---- یہ وہ اصناف ہیں جن کے تحت اردو میں تخلیق ہونے والے مواد کے ایک بڑے حصہ کو ہم عالمی ادب کے معیار کے مطابق پاتے ہیں۔ غزل میں ہمارے ہاں خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور غزل کے

ذریعے ہم نے شعری معراج بھی پائی ہے مگر غزل عالمی ادب میں موجود نہیں ہے لہٰذا مغربی غزل سے اس کے موازنہ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ تنقید کے معاملے میں نیز ناول کے باب میں (مستثنیات سے قطع نظر) ابھی ہم مغرب کے معیار کو پہنچ نہیں پائے۔ آپ نے کہا ہے کہ میرے ذہن میں چند نام ایسے ضرور ہوں گے جن کی تخلیقات کو میں عالمی پایے کا تصور کرتا ہوں۔ مگر ادبا کے نام گنانے کے بجائے ان اردو تخلیقات کی نشاندہی شاید زیادہ مفید ہو جو عالمی پایے کی ہیں۔ میں اس سلسلے میں ایسی تخلیقات کی فہرست مہیا کر سکتا ہوں جنہیں میں عالمی ادب کا ہم پلہ سمجھتا ہوں۔ اکادمی ادبیات پاکستان اور دیگر اداروں کو اعلیٰ پایے کے اردو افسانوں، نظموں اور انشائیوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل مجموعے شائع کر کے انہیں پوری دنیا میں پھیلانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہیں ایسی ادبی اور علمی کتب کے اردو تراجم بھی بڑے پیمانے پر شائع کرنے چاہئیں جو مغرب میں پچھلی چند دہائیوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئی ہیں۔

△ تیسری دنیا کی حد تک انگریز نے اپنے مفادات کی خاطر ادب و سیاست کو ایک دوسرے سے نا آشنا رکھا۔ کیا موجودہ وقت ان میں تال میل بڑھانے کا متقاضی نہیں؟

▲ تیسری دنیا کی حد تک انگریز کی سلطنت کا چراغ گل ہوئے ایک زمانہ ہو چکا۔ اب تیسری دنیا کے بیشتر ممالک آزاد ہیں جن میں ادب اور سیاست کے سنجوگ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ویسے بھی سیاست کے دائرے اتنے وسیع ہو چکے ہیں کہ ادب تو ایک طرف، دنیا کا کوئی شعبہ بھی ان سے باہر نہیں ہے پوری دنیا اب ایک ملک بن رہی ہے جس میں رہنے والا ہر شخص اب دنیا کا شہری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا کے بعید ترین حصے میں بھی جو کچھ ہوتا ہے اس کے اثرات پوری دنیا پر مثبت ہوتے ہیں۔ دنیا کے ممالک کبھی ایک دوسرے سے اس درجہ منسلک نہ تھے جتنے بیسویں صدی کے ربع آخر میں ہو گئے ہیں اور دنیا کے رہنے والے کبھی ایک دوسرے سے اتنے آشنا نہ تھے جتنے اب ہوئے ہیں۔ لہٰذا سیاسی جزر و مد سے کسی بھی ملک کے ادب کا متاثر نہ ہونا اب ممکن نہیں رہا۔ دیگر شعبوں کی میں بات نہیں کرتا۔ البتہ ادب کے معاملے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب تک ادیب سیاسی جکڑبندیوں سے اوپر اٹھ کر تخلیق نہیں کرے گا اس کے فن میں بے زمانی یا Timelessness کا وہ انداز پیدا نہ ہو سکے گا جو ادب کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح کنول پانی میں رہتے ہوئے بھی پانی کی سطح سے اپنا سر بلند رکھتا ہے اسطرح ادب کو بھی سیاست کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی خود کو سیاست سے اوپر اٹھانا ہوگا۔ جو ادبا سیاست اور سیاسی مسائل سے مغلوب ہو جاتے ہیں ان کے ادب میں ابدیت اور عالم گیریت کے عناصر دب جاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ادبا جو سیاست سے کنارہ کش ہوئے بغیر ایک طرح کا کائناتی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے تخلیق کردہ ادب میں زمانوں اور سرحدوں کو عبور کر جانے کی صلاحیت از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ سیاست ادب کے لئے شجر ممنوعہ نہیں ہے مگر اس کی مقدار اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی ادب برداشت کرے۔ زہر کی قلیل مقدار امرت کا درجہ رکھتی ہے مگر زیادہ مقدار مہلک ہے ادبا کو چاہیے کہ اس حقیقت کو ہمہ وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھیں۔

△ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب کو گروہ بندیوں سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ فارمولا یا تجویز موجود ہے آپ اس سلسلہ میں کس قسم کی پہل کے لئے آمادہ و تیار ہیں؟

▲ ادب کی گروہ بندیوں سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جن سینئر ادبا کے مابین شخصی سطح کا تصادم موجود ہے اسے افہام و تفہیم سے دور کیا جائے۔ فکری سطح کے اختلاف کی بات دوسری ہے کیونکہ اس سے تو ادب میں گہرائی پیدا ہوتی ہے لہٰذا یہ جاری رہنا چاہیے گو اس معاملے میں بھی تلخ و ترش مباحث کے بجائے ڈائیلاگ کو رواج دینا ضروری ہے۔ مگر شخصی یا گروہی مفادات کی بنیاد پر گروہ بندیوں کا وجود ادب کے لئے مہلک ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ کیا میں اس سلسلے میں "پہل" کے لئے آمادہ اور تیار ہوں تو عرض ہے کہ میں تو فطرتاً صلح جو ہوں اور چاہتا ہوں کہ ادب میں گروہ بندی کی وبا جلد از جلد ختم ہو جائے لیجئے میں نے پہل کر دی۔ اب بال سید ضمیر جعفری صاحب کی کورٹ میں ہے۔ دیکھتے ہیں وہ اس کا کیا کرتے ہیں!

△ آنے والے وقت کے حوالے سے آپ کی اپنے بارے میں کیا خواہش ہے کہ ادبی مورخ آپ کو نثر نظم یا تنقید میں سے کس حوالے سے بلند مقام پر فائز کرے؟

▲ ہر صنف ادب محض ایک کھڑکی ہے جس میں سے مصنف جھانک رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک سے زیادہ کھڑکیوں میں سے جھانکتا ہوا نظر آئے تو ادبی مورخ پر یہ فرض عائد ہوگا کہ وہ جب اس مصنف کے ادبی مقام کا تعین کرنے لگے تو خود بھی ان ساری کھڑکیوں میں سے مصنف کو دیکھے۔ صرف اسی صورت میں وہ مصنف کو تمام و کمال سمجھنے اور اس کے کام کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو سکے گا میں نے کئی اصناف میں کام کیا ہے یہ سب اصناف مجھے عزیز ہیں۔ شاعری سب سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی ادبی مورخ کو ضرورت پڑی کہ وہ مجھے دیکھے تو میں یہ ضرور چاہوں گا کہ وہ مجھے ٹکڑوں میں نہ دیکھے بلکہ ثابت و سالم حالت میں دیکھے اور پھر ہرچہ بادا باد!

--- بیرون ملک احباب کے ہمراہ---

△ ڈاکٹر انور سدید آپ کے بہت گہرے دوست ہیں انہوں نے آپ سے ادبی رہنمائی بھی حاصل کی ہے اور ہر کڑے وقت میں آپ کا ساتھ بھی دیا ہے۔ آپ فرمائیں کہ آپ نے انہیں بطور شخص اور ادیب کیسا پایا ہے؟

▲ انور سدید ایک انتہائی پر خلوص اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ جن کرم فرماؤں نے ڈس انفرمیشن کے ذریعے ان کے خلاف نفرت پھیلائی ہے وہ اب خود ہی بے نقاب ہو رہے ہیں جب کہ انور سدید کی ہر دلعزیزی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ انور سدید دوستوں کا دوست ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب ہر کسی کو اپنی پڑی ہے' اس شخص نے اپنے دوستوں کی خاطر بڑے بڑوں سے لڑائی مول لی ہے۔ دوسری طرف اس کے دوستوں نے ان کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ وہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ یہ کہ ان کے ہاں انور سدید کی سی جرات اور توانائی کا فقدان تھا۔ وہ دعائے خیر کی حد تک تو پیش پیش تھے لیکن عملی طور پر بہت سست گام تھے۔ مگر انور سدید کا یہ کمال ہے کہ وہ کبھی حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے اور اپنے دوستوں سے بےلوث محبت کرتے چلے گئے۔ بحیثیت ادیب بھی انور سدید کا مقام بلند ہے جو خلوص انکے کردار میں ہے وہی ان کے تخلیق کردہ ادب میں بھی ہے۔ تنقید میں وہ امتزاجی رویے کے قائل ہیں۔ ان کی کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" ایک بلند پایہ تصنیف ہے جسے جدید کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ادبی تاریخ لکھنے والوں میں بھی ان کا نام بہت اہم ہے اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک بہت اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں۔ بحیثیت شاعر بھی وہ تیزی سے آگے آ رہے ہیں اور بحیثیت کالم نگار بھی انہوں نے ایک طرح نو کا اہتمام کیا ہے مجھے ان کی دوستی اور محبت پر فخر ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے انور سدید ایسا پر خلوص دوست ملا۔

وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

جوگندر پال

عام طور پر کوئی شخص اپنے کسی پروفائل میں اتنا ہی دکھ پاتا ہے جتنی اس پوز کی گنجائش ہو مگر وزیر آغا کو انشائیہ نگار کے پروفائل میں دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ ابھی ابھی میں انہیں اس جانب سے دیکھ رہا تھا لیکن اب وہ اپنی اسی تصویر میں گویا دوسری جانب کا پروفائل پیش کرنے لگے ہیں' اور اب؟..... اب وہ مسکراتے ہوئے ایکدم سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں اور ان کا پورا چہرہ آنکھوں میں بھر آیا ہے۔ اپنے انشائیوں میں دراصل وہ اتنے متحرک اور فعال ہیں کہ وہ تو وہ' آپ بھی انہیں پڑھتے بار بار پہلو بدلتے ہیں۔ کیا مجال' آپ کو کسی ایک ہی پروفائل میں ٹھہرا لینا ممکن ہو پائے؟ حقہ پینا ہمارے سامنے کی بات ہے کوئی حقہ پیئے یا سگریٹ' ہماری بلا سے۔ مگر دیکھئے' جب وزیر آغا ہماری توجہ حقے کی گڑگڑاہٹ کی طرف مبذول کرتے ہیں تو ہم اس میں کیونکر دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اس ایک ہی انشائیہ میں ان کی شناخت کے کتنے جداگانہ طبع زاد رخ ہم پہ وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی مجسم فکر کے اس رو پہلے ٹکڑے پر کیا آپ کو ماک ایک کا احساس نہیں ہوتا؟

"حقہ کا وہ نچلا حصہ جسے ریڈی ایٹر کا نام ملنا چاہیے پانی سے لبالب بھرا ہوتا ہے اور کائنات کے ان ابتدائی ایام کی یادگار ہے۔ جب چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ اسے حقے کا "اجتماعی لاشعور" بھی کہا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اجتماعی لاشعور میں ایک نالی زمانے کی طرف سے آ کر گرتی ہے اور چلم میں پیدا ہونے والے دھوئیں کو پانی سے ہم آہنگ کرنے کا اہتمام کرتی ہے' جب کہ دوسری نالی اس اجتماعی لاشعور سے شعور کی طرف لے جاتی ہے اور دھوئیں کو حقہ نوش کے حلق تک پہنچا دیتی ہے۔"

اسی انشائیہ میں دیکھئے کہ انشائیہ نگار نے اب کیسے کسی نہایت منجھے ہوئے موسیقار کا روپ دھار لیا ہے

"بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ جس طرح ایک موسیقار پہلے اپنے ساز کی لے اور آہنگ کو درست کرتا ہے اور پھر کوئی نغمہ چھیڑتا ہے' بالکل اسی طرح ایک فن کار حقہ نوش حقہ سے پانی خارج کرنے کے عمل سے حقے کی گڑگڑاہٹ' کو ایک خاص صوتی مقام پر لا کر گویا "قائم" کر دیتا ہے اور اس کے بعد انگاروں بھری ٹوپی سجا کر حقہ نوشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

انشائیہ کی نہایت نازک صنف میں اگر آپ خواہ مخواہ منہ بڑا پکا کر کے کچے کچے موضوعات کو چباتے ہی چلے جائیں تو قاری کو آپ کے معدے کے تعلق سے خطرہ لاحق ہونے لگتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ انشائیہ سنجیدگی کا متحمل ہی نہیں ہو پاتا۔ انشائیہ کو جو شے نگاہیہ سے میسر کرتی ہے وہ اس کی زیریں لہروں کی متین سی رفتار ہی تو ہے۔ لازم یہ ہے کہ متانت کہیں چھپی ہو کر تھم نہ جائے' بس گھوم گھوم کر آپ ہی آپ بہتی رہے۔ وزیر آغا کے اسی انشائیہ "حقہ پینا" میں ملاحظہ کیجئے۔ وہ خنداں خنداں بات سے بات پیدا کئے جاتے ہیں۔

"مثلاً حقے کی نے جب آپ کے قریب ترین بیٹھے ہوئے کرم فرما کے سیاہ متعفن اور موٹے ہونٹوں کو چھو کر آپ کی طرف لوٹتی ہے اور آپ اسے ڈیٹول سے دھوئے بغیر اس پر اپنے نازک ہونٹ ثبت کر دیتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس تابندہ لمحے میں اپنے جملہ قبائلی' نسلی' خاندانی اور جماعتی تعصبات کو ختم کر کے انسانی اخوت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھا دیا ہے۔ دوسری طرف سگریٹ نوشی ایک قطعاً بور ژوا عمل ہے جو آپ کو مردم بے زاری کی طرف راغب کرنے کے علاوہ ایک ذہنی قلعے میں بھی محبوس کر دیتا ہے....."

انشائیے میں اس کی پوری گنجائش ہے کہ آپ شریر سے نظر آتے ہوئے بھی اپنے سنجیدہ مفاہیم نبھا جائیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کو اپنے کسی برمحل مشاہدے سے شرارت کی تحریک ہو رہی ہو۔ ایک بار پھر "حقہ پینا" میں سے ہی درج ذیل ٹکڑے کی ظلیت اسے نہ صرف نکھا بناتی ہے بلکہ قاری کو فکر کی پگڈنڈی پر بھی آزاد چھوڑ دیتی ہے۔

"اگر کھانا نوش کرتے ہوئے شخص کے منہ میں کسی طرح رنگین ٹیلیویژن کیمرہ مع' ایک خوش پوش اناؤنسر فٹ کر دیا جائے تو پھر آپ کو دانتوں کے جارحانہ عمل کا شاید کچھ اندازہ ہو سکے۔ دوسری طرف حقہ پینے والے شخص کے منہ میں کچھ بھی تو نہیں ہوتا صرف ہونٹ لحظہ بھر کیلئے بند ہوتے ہیں اور سانس اندر کی طرف کھنچتا ہے۔ اور جو چنگی بھر دھواں اندر گیا تھا' نخوت کے غبار میں لپٹا نتھنوں کے دو دکش میں سے گزر کر واپس آ جاتا ہے۔ اس سارے عمل

میں کوئی حیوانیت یا جارحیت نام کو بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ تو جارحیت کو سلاتا اور انسان کو تہذیب کی دوڑ میں آگے کو لے جاتا ہے۔"

وزیر آغا کا ہر انشائیہ بیک وقت مختلف کیفیتوں میں بہہ رہا ہوتا ہے۔ یہاں ہموار سطح پر ایک سیدھ میں' یہاں کوئی موڑ لیتا ہوا' یہاں امنڈا امنڈا' یہاں آنکھیں موندے۔ ان کے انشائیہ کا یہی چمتکار دکھانے کیلئے میں نے جان بوجھ کر ان کے ایک ہی انشائیہ سے درج بالا متنوع قسم کی کیفیات کی نشان دہی کی ہے۔ یہیں حقے کی نے کے بیان میں ان کی واردات کی افسانوی چستی پر بھی نظر ڈالتے جایئے۔

"یہ نئے حقہ نوش کے کردار کی مناسبت سے کبھی نیزے کی طرح سیدھی ہوتی ہے' کبھی آداب عرض کے سے انداز میں خم دار اور کبھی زہریلے سانپ کی طرح سر سے پاؤں تک کنڈلی مارے ہوئے!"

وزیر آغا کی اس رنگا رنگی کی بدولت ایک تو بذات خود صنف انشائیہ کی کشادگی کی طرف دھیان جاتا ہے' دوجا' آغا صاحب کے تخلیقی جوہر کی طرف' جس باعث یہ صنف مزید کشادہ ہو گئی ہے۔

گزشتہ چند سال ہمارے یہاں انشائیہ کا ذکر فکاہیہ اور طنزیہ ---- جنہیں خالص فکاہیہ اور طنزیہ کا نام دیا جانے لگا تھا ---- کے باب میں روا رکھا گیا۔ اس تعلق سے بعض وضاحتیں نہایت ضروری ہیں' ورنہ ہم گمراہ ہو کر بھی اصرار کرتے رہیں گے کہ ہم تو صحیح راستے پر تھے' جگہیں ہی بے جگہ ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جگہیں عین اپنی جگہوں پر ہوتی ہیں' ہم ہی ان کے آگے پیچھے سرک کر انہیں کھو دیتے ہیں۔ خالص فکاہیہ یا طنزیہ آدمی کے ہنسنے یا چوٹ کرنے کی فطری خواہشوں سے عبارت ہے۔ ایسے ہی خواہشوں کی تکمیل کیلئے سبھی ذی جان ---- انسان یا حیوان ---- ایک دوسرے کے وجود کے بعض حصوں کو گدگدا کر ہنسی سے بے حال ہو جاتے ہیں' یا پھر گتھم گتھا ہونے سے پہلے ایک دوسرے پر غصے میں بے اختیار غراتے ہیں۔ یہ معصوم خواہشیں بلا شبہ ہماری ہنگامی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان کرتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کی افادیت میں شک نہیں۔ تاہم زندگی کے مانند ادب میں بھی ہنسنے رونے یا غصہ کرنے کی واردات بے سیاق مفروضوں کی دین نہیں ہوتی۔ واردات زندگی کرنے کے عمل کو زندہ تلازموں کے ساتھ تخلیقی تحریروں میں رچانے بسانے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی ادبی صنف میں ادب کو اولاً جینے مرنے کا کوئی تناظر پیش کرنا ہوتا ہے اور پھر قاری اس تناظر میں شریک ہو کر اپنے رد عمل کے طور پر ہنستا روتا یا غصے میں آتا ہے۔ ہمارے ادب میں خالص فکاہیوں اور طنزیوں کی مقبولیت کے باعث یہ المیہ رونما ہوا کہ ہنسنے ہنسانے یا ایک دوسرے پر چوٹیں کرنے کو بذات خود ادبی شرکتوں سے تعبیر کیا جانے لگا' حالانکہ ادبی سطح پر قاری کا کوئی بھی گہرا تاثر زندگی کی کسی گہری سچویشن کی آگہی کے دباؤ سے ظہور میں آتا ہے۔ جس تحریر سے اس امر کا احساس ہو کہ مصنف نے اسے قاری کو بے واسطہ ہنسانے یا رلانے کیلئے رقم کیا ہے وہ اپنے ان مقاصد کو پورا کر پانے کے باوجود ادبی طور پر بانجھ ہوتی ہے۔ صنف انشائیہ اس تناظر میں ان سارے تقاضوں کا بخوبی احاطہ کرنے کی اہل ہے جن کی بدولت تحریر کی ادبیت اور تخلیقیت پر انگلی نہ رکھی جا سکے۔

ہمیں اپنے شعری ورثے پر بجا طور پر ناز ہے' پھر بھی کسی سماج کے نزدیک اگر تخلیقی نثر کے فروغ کا سامان غیر ضروری قرار پا جائے تو وہ اپنی مجموعی فکر کی مہذب ترخوؤں کو بے روک ٹوک پنپانے سے قاصر رہتا ہے۔ ہماری زبان میں ایک طویل مدت تک یہی ہوتا آیا ہے۔ نتیجتاً ہمارے لوگوں کے روز مرہ کے رویے مضحکہ خیز ڈرامائیت کے حامل ہیں۔ ماتویوں ہی گپیں ہانکتے ہوئے بھی وہ کسی رزمئے کی سچویشن سے دو چار ہوں۔ کوئی محض کسی کا نام پوچھتے ہوئے بھی لہجے میں اس قدر رقت پیدا کر لیتا ہے جیسے کنگ لیئر کو آبدیدہ ہو کر اپنی اولاد کی ناشکری کا کرب جھیلنا ہو۔ جس طرح انگریزی زبان کی بربری بلند آہنگی کو پہلے پہل معتدل کرنے اور پھر اس میں دلاویز سادھیما پن لانے میں ایسے نے رول نبھایا ہے اسی طرح اردو میں بھی انشائیہ ہمارے اظہار کی مناسب تہذیب کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ اس ضمن میں انشائیہ کی مقبولیت کی خاطر وزیر آغا کی پیش روی واقعی نہایت مستحسن ہے۔ انہوں نے زبان و کلچر کی آئندہ ضرورتوں کو محسوس کر کے نہ صرف بڑے صبر اور تدبر سے اس صنف کے تمیس کا پرچار کر کے اسے اعتبار کا درجہ عطا کیا اور انشائیہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ تیار کرنے میں معاون ہوئے بلکہ ایسے کو مقامی مٹی میں بو کر اسے سالہا سال سینچتے رہے اور اپنے انشائیوں کا گلزار کھڑا کر کے چار سو بھانت بھانت کے رنگ اور خوشبوئیں بکھیر دیں۔

وزیر آغا سے پہلے دو لکھنے والوں کا خیال آتا ہے جنہوں نے ہمارے ادب میں انشائیہ کی راہ ہموار کی۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی۔ پطرس کے یہاں طنز و مزاح کی پرکار بار یکیوں کے باوصف مثالی انشائیہ کے لوازم ابھر کر نہیں آتے۔ انشائیہ نگار کو اس خوبی پر حاوی ہونا چاہئے کہ ذ یکیوں سے تھک جانے پر وہ سطح آپ پر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دے اور مزے سے فلوٹ کرتا ہوا دکھے۔ ہمہ دم کرشمہ سازی کی چاہ سے انشائیہ کی روح بری طرح متاثر ہو سکتی ہے۔ پطرس سے ایک یہی نہ ہو پایا کہ اپنے آپ کو ایک ذرا سی ڈھیل دے پائیں۔ ان کا شائستہ تیکھا پن ان کی طبع زاد جینئس کا بڑا دل پسند نمائندہ ہے لیکن مغرب کے

ان تربیت یافتہ پروفیسر صاحب کو اپنے ہی گھر میں ایک کمرے سے دوسرے میں جاتے ہوئے یہ کھٹکا لگا رہتا کہ ان کے لباس میں کہیں شکن تو نہیں آگیا۔ ایسے شخص کو خالص انشائیہ کی غیر آہن شدہ سادگی کیوں کر خوش آتی؟ پروفیسر صاحب اگر کبھی اپنے آپ کو انشائیہ کی بے دھیان خبر گیری سے کام لیتے ہوئے پکڑ لیتے تو اسی دم اپنے اندر سے انشائیہ نگار کو اس طرح نکال پھینکتے جیسے اپنے کسی بگڑے طالب علم کو کلاس روم سے۔ اسی طرح پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی اپنے بعض دیگر بے مثال اوصاف کے باوجود تامل اور تکلیف کے باعث انشائیہ کے کھلے میں آنے سے جھجک برتتے رہ گئے۔ پڑوس میں حادثے کی خبر پا کر اب یا تو آدمی ننگے پیر اس طرف دوڑ کھڑا ہو یا پھر اپنی اچکن ڈھونڈتا پھرے۔ اس میں شک نہیں کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی مشرقی وضع و مروت کی حدود کے اندر بھی کئی کارگر راستے دریافت کر لئے، تاہم وارفتہ شاہ راہیں اپنے اوپر حرام قرار دے کر وہ بھی انشائیہ کے عین اس مقام سے کہیں آگے پیچھے رہ گئے۔

وزیر آغا نے یقیناً ان دونوں اساتذہ کے اسالیب کے بعض پہلوؤں کو دل و جان سے چاہا ہو گا مگر اپنے انشائیوں میں انہوں نے بجا طور پر ایک ہی تحفظ کو روا رکھا ہے۔ اور وہ انشائیہ کی داخلی ہیت کا ادراک۔ یہ تحفظ دراصل واردات کے بے تحفظ تعاقب اور موقع اور موڈ کی برجستگی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں۔

"آج سے کچھ عرصہ قبل میں نے اصغر ندیم سید کا ایک ٹیلی ویژن ڈراما دیکھا تھا۔ جس میں ایک کردار دوسرے سے کہتا ہے کبھی دوسرا کنارہ بھی تو دیکھنا چاہئے۔ بعد ازاں جب ایک روز اصغر ندیم سید سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ صاحب! آپ نے تو ایک لمحہ خود فراموشی میں انشائیہ کے اصل مزاج ہی کو پیش کر دیا، کیونکہ انشائیہ "دوسرے کنارے کو دیکھنے ہی کی ایک کاوش تو ہے ------ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا پہلا "کنارہ" دوسرا کنارہ بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے اور آپ اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔"

مانوسیت اور استعجاب کے مڈبھیڑ میں انشائیہ نگار پر جو انشائیہ کی داخلی ہیت کھلنے لگتی ہے تو وہ آپ بھی بے تحفظ کھلتا چلا جاتا ہے اور اس کی سوچ محض منطقی ہونے کی بجائے تخلیقی ہو ہو کر وائڈی تحریر میں کھلنڈرانہ پھوٹ پڑتی ہے اور اس طرح پھوٹ پڑنے سے ہی انشائیہ کسی اطلاعی مضمون سے الگ پہچان بنا پاتا ہے۔ ہجرت کے موضوع پر وزیر آغا کے ساتھ اس دائرے میں جھول کر دیکھیے!

"ہر ہجرت سے ایک نیا امریکہ دریافت ہوتا ہے، نئے رشتے وجود میں آتے ہیں، نئے معانی اجاگر ہوتے ہیں --- ہجرت سے صدیوں کا زنگ اترتا ہے، آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی ہے، اپنے پرائے کا فرق دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہجرت کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ چاہے ہجرت ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہو، ایک حویلی سے دوسری حویلی کی جانب یا ایک بدن سے دوسرے بدن کی اور --- ہر کوندا دراصل حیرت کا کوندا ہے اور حیرت ہجرت کے بغیر ممکن نہیں۔"

سنجیدگی کا لازمہ اس کے کسی مخصوص خارجی پوز سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا ہوتا تو برصغیر کے لوگ دنیا میں سب سے زیادہ سنجیدہ قرار دیئے جا سکتے مگر سچائی یہ ہے کہ اپنے نہایت فکر مند بشرے کے پیچھے انہیں خالی پیٹ کی بھائیں بھائیں کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہوتا اور وہ گویا اپنی اسی ذہنی کیفیت میں پکڑے جانے کے خیال سے منہ کو اس قدر دبا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اسی نوعیت کی بیمار اور رکی تھمی قوموں کے بہتر معمول زندگی کے لئے انشائیہ کی بے تامل مسکانیں اکسیر کا کام دے سکتی ہیں۔ اس صنف کی ایک نمایاں خوبی اس کی بے تشویش کھلی کھلی فکر مندی ہے۔ انشائیہ پڑھتے یا لکھتے ہوئے آپ دراصل بڑی گہری سوچیں سوچ رہے ہوتے ہیں اور اس عالم میں قطعاً لاعلم ہوتے ہیں کہ آپ کہاں سے کہاں آپہنچے ہیں اور آپ کو ابھی کہاں پہنچنا ہے۔ ایسے ہی بھٹک بھٹک کر آپ پر کائناتی اسرار منکشف ہوتے ہیں ورنہ اگر آپ اپنی محفوظ دیواروں میں چپ چاپ گھرے رہیں تو بیٹھے بیٹھے ذی جان سے شے میں منقل ہو کر رہ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں سے مل کر آپ کو لگتا ہے کہ ان سے آپ کی ملاقات ہونے سے رہ گئی ہے، آپ بس ان کے ناموں، پیشوں اور فرنیچر سے مل کر لوٹے ہیں۔ آیئے، وزیر آغا کی "کھڑکی" سے جھانک کر دو جہان میں خندہ زن بھٹکئے اور سبک ہو جایئے۔

"کھڑکی کمرے کی آنکھ ہے۔ جس کمرے میں کھڑکی نہ ہو وہ اندھا ہے ----- جب آپ کھڑکی کھول کر اپنی پلکیں اوپر کو اٹھاتے ہیں تو وقت کے رہوار پر بیٹھ کر ہوا ہو جاتے ہیں اور آپ کو راستہ دینے کے لئے مکان space کو دور دور تک پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ کھڑکی سے دیکھنا اپنی ذات کو وسعت آشنا کرنا ہے۔ اس سے مراد صحیح معنوں میں زندہ رہنا ہے۔

گوئٹے کے بارے میں سنا ہے کہ جب وہ مرنے لگا تو اس نے کہا تھا "روشنی! روشنی"! لوگوں نے سوچا شاید ہذیان بک رہا ہے، حالانکہ وہ کمرے کی کھڑکی کھولنے کو کہہ رہا تھا -----"

ساری بات تو کھڑکی کھلنے کی ہے۔ جب لوٹنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور پیروں کو بھی یہیں چھوڑ کر نکل پڑنا ہو تو بھٹکئے بھٹکئے جہاں بھی پہنچ گئے، وہی ٹھکانہ!

ایک اچھے انشائیہ کو پڑھتے ہوئے قاری اس میں اس قدر شریک ہو جاتا ہے گویا وہ آپ ہی آپ اسے دریافت کر رہا ہو' وہی اسے لکھ رہا ہو۔ یہ صنف فی الحقیقت اتنی غیر رسمی ہے کہ معلوم ہوتا ہے چند بے تکلف دوست باہم بیٹھے بات چیت کئے جا رہے ہیں اور جو کچھ بھی وہاں سنا جا رہا ہے وہ سبھی کہہ سن رہے ہیں ساجھ اور رفاقت کی ان گنجائشوں سے قاری کو بود و باش کے لئے اتنی وسیع زمین میسر آجاتی ہے جہاں کوئی کنارا نہیں' وہ جدھر بھی منہ اٹھا کر نکل جائے اسے اپنی ہی زمین پر گھومنے پھرنے کا احساس ہوگا۔ وزیر آغا نے یہ گنجائشیں برابر ملحوظ رکھی ہیں "چلنا" کے مندرجہ ذیل ٹکڑے کو محسوس کیجئے۔ مصنف کی رفاقت میں آپ کو لگے گا کہ ان کی بجائے آپ ہی سوچ رہے ہیں:

"لیٹنا خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہے' بیٹھنا کسی چوہے کے بل میں سے سر نکال کر اور گرد و پیش پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ بل میں دبک جانا ہے لیکن چلنا بل کو الوداع کہنا اور کھلے منہ سرِبازار نکل آنا ہے ——— چلنا ایک گہرے عزم کا عمل ہے' ایک زبردست قوت ارادی کے بغیر دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں ——— چلنے والا ہمیشہ ایک خاص سمت میں سفر کرتا ہے' سمت منزل کی طرف دوڑتی ہے اور منزل شخصیت کی تکمیل کا اعلان کر دیتی ہے ———"

مولوی عبدالحق سیمینار بھارت

بات محض چلنے سے شروع ہوئی اور تکمیل میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وزیر آغا کا یہ نہایت فطری اندز ان کے فارم کے سرسبز پیڑوں کا ہے جو بظاہر اتنے سادہ نظر آتے ہیں اور اپنی ساری پیچیدگیاں اپنے اندر ہی اندر چھپائے ہوتے ہیں اور انہیں یوں لہلاتے ہوئے دیکھ کر انہی کے مانند لہلانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ انشائیہ کا یہ انداز قاری کو مرعوب کرنے کی خواہش سے قابو میں نہیں آتا۔ اسے سوچ کا ساجھی بنا لینے کی تمنا سے پروان چڑھتا ہے۔ وزیر آغا کے ان پیڑوں کے سائے میں بیٹھ کر ہم گویا بھانت بھانت کے پنچھیوں کی صداؤں پر کان دھرے ہوتے ہیں اور اس محویت میں سر اوپر اٹھاتے ہیں تو کسی ایک پنچھی پر نظر نہیں ٹھہرپاتی بلکہ سب کے سب ہماری آنکھوں میں ڈال ڈال چہچہا رہے ہوتے ہیں اور آکاش کی درخشندہ نیلاہٹ ہمیں اتنی جھکی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ اک ذرا ہاتھ بڑھا کر ہم اسے چھو لیں۔

وزیر آغا ساری عمر دم پھونک پھونک کر اپنی یہ مایا' یہ لیلا رچا پائے ہیں۔

○

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید

(1958ء سے 1991ء تک)

پچھلے پینتیس سالوں میں ڈاکٹر وزیر آغا نے شاعری، انشائیہ اور دیگر متعلق اصناف پر مشتمل متعدد کتابیں پیش کرنے کے علاوہ نظری اور عملی تنقید پر مشتمل تیرہ کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ تنقید کے اس منظرنامے کا کسی ایک مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کی تنقید کی عہد بہ عہد کروٹوں کو نشان زد کرنے کیلئے ان کی ہر تنقیدی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ توقع ہے کہ اس سے ان کی تنقید کی تدریجی ارتقا کا ایک خاکہ سامنے آجائے گا جو تنقید کے طالب علموں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

مرتب سجاد نقوی

"ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانہ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے چنانچہ مزاحیہ کردار صرف اس لئے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محفوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایسا کردار چچا چھکن کی طرح اپنی اس عینک کی تلاش کرے جو اس نے اپنی ناک پر لگا رکھی ہو تو خواہ مخواہ اس پر ہنسنے کی تحریک ہوتی ہے قدیم قبائل میں اجنبیوں کے لباس، گفتار اور عادات و اطوار کو نشانہ تمسخر بنانے کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں وہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔ دراصل ہنسی اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کیلئے تو باعث انبساط ہوتی ہے لیکن اس فرد کو رنج و ندامت سے ضرور ہمکنار کر دیتی ہے۔ جس کے خلاف یہ عمل میں آئے بہرحال یہ بات طے ہے کہ ہنسی ایک لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض غیر شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر گلے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلے سے علیحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطہ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی بیشتر بیرونی لیکن مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی ان تمام اندرونی نقائص کے استحصال کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں، اردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے ہاں مزاح کا جو افادی پہلو بڑے نمایاں انداز میں کارفرما نظر آتا ہے وہ ہنسی کے اسی اصلاحی رجحان کی غمازی کرتا ہے"۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح 1958ء) صفحہ 27

○

"شعر کی دنیا میں تصورات اور محسوسات کو قاری تک منتقل کرنے کے عمل میں بھی لفظ کا طریق کار غور طلب ہے۔ یہ طریق کار مچھلی پکڑنے کے عمل سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ اس طرح کہ انسان کا اجتماعی لاشعور ایک سمندر کے مانند ہے جس کی گہرائی اور وسعت کی کوئی حد نہیں، اس سمندر میں نہ صرف نسل انسانی کا سارا سرمایہ بعض نقوش کی صورت میں محفوظ ہے۔ بلکہ یہ خیالات، تصورات اور تخلیقی عناصر کی بھی آماجگاہ ہے۔ تشبیہ کو وسعت دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے تجربات و حوادث اپنے قیمتی سرمائے کو ساتھ لئے ندیوں اور دریاؤں کی صورت اس سمندر میں ازل سے گر رہے ہیں۔ اور ابد تک گرتے چلے جائیں گے۔ شاعر کا کام اجتماعی لاشعور کے سمندر سے خیالات، تصورات اور تخلیقی عناصر کو اپنی گرفت میں لینا ہے۔ لیکن وہ اس عمل میں کامیابی کیلئے کیا جتن کرے؟ اس مقام پر لفظ اس کے کام آتا ہے اور وہ لفظ کو (BAIT) کے طور پر ڈور کی مدد سے سمندر میں ڈال دیتا ہے لفظ کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنی مخصوص لذت، آہنگ اور خوشبو کی مدد سے خیال کو اپنے ساتھ چپکا کر بالکل اسی طرح باہر لے آتا ہے جیسے کانٹے کے ساتھ مچھلی باہر آجاتی ہے۔ لیکن اس تشبیہ کے کچھ اور پہلو بھی ہیں مثلاً یہ کہ تخلیق شعر کا ہر عمل دراصل غواصی کا عمل ہے اور ڈور جس قدر لمبی اور لفظ جس قدر نوکیلا اور توانا ہو گا اسی نسبت سے وہ مچھلی کے نادر نایاب نمونوں کو گرفت میں لے سکے گا۔ پس شعر کی تخلیق میں غواصی کا عمل ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس غواصی کے سلسلے میں لفظ کی اہمیت مسلم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فن کار یا شاعر کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ دو اشیاء کے مابین ایک ایسا ربط دریافت کرتا ہے جو اس سے قبل دریافت نہیں ہوا تھا۔ غواصی کا عمل بھی اسی لئے

قابل قدر ہے کہ یہ سمندر کی سطح اور سمندر کی گہرائی کے درمیان آمد و رفت کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں شاعر اس ربط کو دریافت کر لیتا ہے جو فرد کی خارجی زندگی اور اس کے اجتماعی لاشعور کے درمیان پہلے سے قائم تھی۔

(نظم جدید کی کروٹیں 1963 صفحہ نمبر 17)

○

"شعر کی تینوں اصناف (گیت، غزل، نظم) کو اس برصغیر کے ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ آغاز کار میں ہندوستانی معاشرہ دراصل جنگل کا معاشرہ تھا اور اس میں تہذیب الارواح کا نظام، لنگ اور یونی کی پوجا کا تصور اور دائرے میں گھومتے چلے جانے کا طریق پوری طرح رائج تھا۔ یہ نظام ہزار ہا برس تک قائم رہا ہو گا پھر اچانک بحیرہ روم کے علاقے سے ایک قوم اٹھی جو ایک طویل عرصہ تک صحرا نوردی میں مبتلا رہنے اور شکار کی تہذیب سے واضح اثرات قبول کرنے کے بعد اس برصغیر (ہندوستان) میں داخل ہو گئی۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں اور نو وارد قوم کے افراد میں جو آویزش اور میل جول پیدا ہوا اس کے نتیجے میں وادی سندھ کی تہذیب نے جنم لیا۔ بے شک بنیادی طور پر یہ ایک مادی تہذیب تھی اور اس نے ایک ٹھہرے ہوئے معاشرے کو جنم دیا تھا تاہم اس میں نو واردوں کی آمد سے کسی نہ کسی حد تک داخلی تصادم بھی پیدا ہوا ہو گا۔ وادی سندھ کے شہروں میں نہانے کا تالاب اور شیو دیوتا کا وجود، مذہب کی ابتدا ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ اس معاشرے میں گیت کی ابتدائی صورت بھی وجود میں آئی ہو گی۔ تاہم چونکہ اس تہذیب کی لپی ابھی تک پڑھی نہیں جا سکی۔ اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن ہے۔ ایک ہزار پانچ سو قبل از مسیح کے لگ بھگ آریاؤں نے وادی سندھ کے علاقے پر حملہ کیا تو گویا ہندوستانی معاشرے کے تالاب میں روح کا پہلا اہم تحرک بھی پیدا ہوا۔ دراوڑی تہذیب اور آریائی تہذیب کا یہ ملاپ عورت اور مرد کا ملاپ تھا۔ شاعری میں یہ تحرک بت پرستی کے اس رجحان کی صورت میں ابھرا جس میں محبت (والہانہ اور مجنونانہ پوجا) کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس دور کی شاعری میں پرستش اور پوجا کا رجحان ہی ایک بنیادی رجحان تھا۔ یہ رجحان رگ وید کے اشلوکوں سے لے کر امرو، کالی داس، بھرتری ہری اور ان کے کافی عرصہ بعد میرا بائی، ودیاپتی، تلا رام اور دوسرے وشنو بھگتی شعرا تک عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے ہندوستانی تہذیب کو دوسرے بڑے تہذیبی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ ثقافتی اعتبار سے اس تصادم کی نوعیت آسمان اور زمین کے ملاپ کی سی تھی اور اس کے نتیجے میں شاعری ایک نئے "تحرک" سے آشنا ہوئی یہ تہذیبی تصادم "غزل" ایسی صنف کے فروغ کا باعث ثابت ہوا۔ جس میں کل اور جزو کا فراق وجود میں آتا ہے اور فرد بت پرستی کے عمل کو تج کر (یعنی ماں کی دنیا سے منقطع ہو کر) آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہرحال مسلمانوں کی آمد کے بعد غزل کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہ صورت حال انگریز کی آمد تک جاری رہی۔ انگریزی تہذیب، ہندوستانی معاشرے کیلئے تیسرے بڑے تصادم کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے نتیجے میں مغرب کے اثرات عام ہوئے اور یوں نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ نظم کے اس فروغ کا باعث سوسائٹی کا وہ تحرک بھی تھا جو فرد کی انفرادیت کو سطح پر لانے کا موجب بنا تھا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اس برصغیر میں اشیا کی فراوانی ناپید ہے گھر اور خاندان کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہو رہا ہے۔ اور فرد، خاندان کے ایک معمولی پرزے کی حیثیت کو تج کر خود ایک علیحدہ کل میں ڈھلنے لگا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے باعث مغرب میں انفرادیت کا رجحان اور اس کے نتیجے میں نظم کا فروغ ممکن ہوا تھا اور یہی باتیں آج کے معاشرے میں نظم کی ترویج اور فروغ کا باعث ثابت ہو رہی ہیں"

(اردو شاعری کا مزاج 1965ء صفحہ --- 441)

○

"قصہ یہ ہے کہ فن کار بیک وقت فن کار بھی ہوتا ہے اور قاری بھی۔ وہ اپنی ذات کے ایک رخ سے کچھ حاصل کر کے اپنی ہی ذات کے دوسرے رخ کے حوالے کر دیتا ہے اور یہ عمل تجارت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ تو بات یہاں تک پہنچی کہ شاعر کے اندر تخلیق کا ثمر پختہ ہوا اور جھولی میں آن گرا۔ یعنی امیج کی لفظ میں تجسیم ہو گئی۔ پھر جب یہ باہر کے قاری کے سامنے آیا۔ (اور زمانہ بجائے خود ایک قاری ہے) تو اس نے جھولی کی تہوں کو یہاں وہاں سے کھول کر اس ثمر کے ان گنت رنگوں اور خوشبوؤں کو ایک تخلیقی سطح پر محسوس کرنے کی سعی کی گویا وہ ایک الٹے تخلیقی عمل میں مبتلا ہوا ثمر اور جھولی کا رشتہ کسی لین دین کے تابع نہیں بلکہ ایک ہی تخلیقی عمل کے دو مدارج کا امتزاج ہے اور یہ صرف اس وقت تخلیقی کہلاتا ہے جب اس میں تخلیق کی ایک برقی رو سرایت کر جاتی ہے۔ تخلیق کا کام باہر کے قاری تک کسی نظریے کی ترسیل ہرگز نہیں بلکہ ایک ایسے امیج کا احساس دلانا ہے جس کے اندر بہت سے امیجز کو متحرک کرنے کی سکت پیدا ہو گئی ہو۔ آخری بات یہ ہے کہ تخلیق جب تک ایک میلا کچیلا بادل کا ٹکڑا ہے۔ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں لیکن جب یہ ٹکڑا

(THUNDER CLOUD) بن جاتا ہے تو سبحان اللہ!" ("تنقید اور احتساب" 1968ء صفحہ 265 اور 272)

○

"یہ بحث اب اس نازک مقام تک آپہنچی کہ جب تخلیق کا مزاج (CHAOS) کے روائتی طوفان میں گھر کر ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوا تو وژن روشنی اور آزادی کی ایک نوید بن کر اس کے ذہن کے افق پر نمودار ہوگیا اور اسے دیکھتے ہی تخلیق کار کے اندر آزاد ہونے کی ایک شدید خواہش پیدا ہوگئی۔ ایک تلمیح کی مدد سے اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یوسف چاہ یوسف کے اندھیرے میں محبوس سانس رکنے کے عالم میں مبتلا تھا کہ کنویں کے دہانے پر سے پتھر کی سل ہٹ گئی اور یوسف کو روشنی اور آزادی کا ایک راستہ دکھائی دے گیا مگر اس سے یہ ہوا کہ خود یوسف کے دل میں آزاد ہونے کی آرزو دو چند ہوگئی اور وہ اندھیرے (بے ہیتی) کی دنیا سے نجات پانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ فن کی دنیا میں جب تخلیق کار اس مرحلے سے گزرتا ہے تو سانس لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس ازلی و ابدی آہنگ کو چھو لیتا ہے جو تمام صورتوں کے پس پشت موجود ہے لیکن جس تک انتہائی داخلی کرب کی حالت ہی میں پہنچنا ممکن ہے یہ "آہنگ" ایک طرح کی برقی قوت ہے جو تخلیق کار کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی مشین کیلئے ایندھن کا کام دیتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جب تک تخلیق کار اس "آہنگ" کی برقی رو کو چھو نہیں پاتا۔ اس کے اندر کی تخلیقی مشین اپنے وجود کا اعلان نہیں کرتی۔ تاہم اگر وہ اس آہنگ کو چھونے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے اندر تخلیقی مشین حرکت میں آجائے گی اور تخلیق کا راس بے ہیت کچے مواد سے (جسے ناموجود (NOTHINGNESS) کا نام دینا چاہئے اور جو مفصل اور فعال تجربات کی آویزش کا نتیجہ تھا (اس) وژن کی تجسیم کرسکے گا جو چاہ یوسف کی گہرائی سے اسے دکھائی دیا تھا۔ گویا "آہنگ" اسے قوت مہیا کرے گا جس سے تخلیقی مشین حرکت میں آکر اسے اوپر کو اٹھائے گی (PUSH) وژن اسے اپنی طرف کھینچے گا (pull) اور وہ اندھیرے کنویں سے دن کی روشنی میں آجائے گا۔"

(تخلیقی عمل صفحہ 201 ___ 1970)

○

"یہ بات شوپنہاور سے منسوب ہے کہ تمام فنون موسیقی کی سطح پر پہنچنے کی تمنا کرتے ہیں۔ اس بات کی توضیح کرتے ہوئے ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے کہ موسیقاری وہ واحد ہستی ہے جو اپنے شعور کے بطون سے فنی تخلیق کو جنم دیتا ہے ورنہ دوسرے فن کار تو ظاہر کی دنیا سے کچا مواد حاصل کرنے پر مجبور ہیں مثلاً مصور رنگ اور صورت کا دست نگر ہے اور شاعر الفاظ کا اور معمار مجبور ہے کہ چونے گارے کے ریختہ میں اپنی ذات کا اظہار کرے مگر ذریعہ چاہے کوئی بھی کیوں نہ استعمال کیا جائے مقصد اس کا صرف یہ ہوتا ہے کہ شے یا منظر کو اوپر اٹھا کر "غنائیت کی سطح" پر پہنچا دیا جائے۔ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ یہی بات کہانی لکھنے والوں کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ چاہے وہ کردار کے نقوش کو اجاگر کریں یا ٹائپ (TYPE) کو بروئے کار لائیں۔ بند ماحول کو پیش کریں یا کشادہ کینوس کو سامنے لائیں۔ قریب سے نظارہ کریں یا دور سے نظر ڈالیں، وہ ہر حال میں مجبور ہیں کہ "کہانی کی سطح" پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر افسانہ۔ جو اب مضمون بن جائے گا یا ایک شعری پیکر یا محض نثر کا ایک ٹکڑا۔ چنانچہ میں اپنی بات کی ابتدا اس کلیہ سے کروں گا کہ افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔

(نئے مقالات ___ صفحہ 163 تا 164 .....1972)

○

اقبال کے نظام فکر میں عشق اور خرد کی کہانی کچھ یوں مرتب ہوئی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سفر کے دو مراحل ہیں۔ ابتدا عقل کا تخیلی اور تجزیاتی عمل ہے جو عشق کے وجدانی عمل میں ضم ہو جاتا ہے۔ عشق دائرے میں حرکت کرتا ہے اور اس کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز سے تیز ہوتی چلی جارہی ہے تا آنکہ زراج یا بے ہیتی کی وہ صورت وجود میں آتی ہے جسے خود فراموشی کا نام ملنا چاہئے۔ اسی عالم میں دائرے کی لکیر ٹوٹتی ہے اور عشق کی رفتار کائنات کی رفتار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہ لحہ تخلیق کا لحہ ہے جس میں انسان بے ہیتی کے عالم سے ایک نئی ہیت کو جنم دیتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اپنے شعور اور بصیرت کو بھی بروئے کار لاتا ہے گویا ابتدائی مراحل میں عقل اور شعور کے جو عناصر اس کی ذات میں جذب ہوئے تھے وہ انتہائی مراحل میں آگہی کی نیت میں اس طور شامل ہو گئے کہ بے خودی کے باوصف خودی وجود میں آگئی اور انسان کیلئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنی ذات کو نہ صرف "بے خودی میں کھو جانے سے باز رکھے بلکہ اسے کائنات کی تخلیقی قوت کے سامنے ایک متوازی قوت کے طور پر ابھار دے۔ غور کیجئے تو یہ ساری کہانی فن کے تخلیقی عمل کی کہانی ہی سے مشابہ ہے۔"

(تصورات عشق و خرد (اقبال کی نظر میں) صفحہ 232 .....1977)

○

"کیا ادب اس لئے ادب ہے کہ اس میں زمین کی بو باس موجود ہے یا اس لئے کہ اس میں آفاقیت کا وہ عنصر موجود ہے جو ایک عام ادب پارے کو ایک کاروباری تحریر سے جدا کرتا ہے؟ ---- میری نظروں میں ادب کی تخلیق میں ان

دونوں عناصر کی شمولیت از بس ضروری ہے۔ تاہم ابھی تک کوئی ایسا کمپیوٹر ایجاد نہیں ہو سکا جو اس بات کا اعلان کرے کہ ادب میں اتنے فیصد ارضیت یا آفاقیت ہو تو ادب بنتا ہے۔ ادب میں ارضیت اور آفاقیت کا وہی رشتہ ہے۔ جو جسم اور روح کا ہے جسم نہ ہو تو روح محض ہوا میں معلق ہے اور روح نہ ہو تو جسم محض ہڈیوں کا ایک انبار ہے۔ پھر جسم اور روح الگ الگ خانوں میں مقید بھی نہیں اور نہ ان کا ملن کسی تقریب یا تہوار کی آمد کا منت کش ہے۔ جسم میں روح اس طور سرایت کرگئی ہوتی ہے کہ کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ روح صرف یہاں موجود ہے۔ یہی حال ادب کا ہے کہ ارضیت تو اسے گوشت اور استخوان، خون اور گرمی مہیا کرتا ہے اور آفاقیت اسے جذبے کی گرانباری سے اوپر اٹھ کر کون و مکاں کا احاطہ کرنے کی سکت بخشتی ہے۔ بات کو الٹ کر ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب وہ ہے جو اپنا جسم تو مرزبوم سے حاصل کرتا ہے لیکن پھر تخلیقی مشین سے گزر کر ہوا کی طرح سبک خرام اور خوشبو کی طرح لطیف ہو جاتا ہے اور یہی لطافت اور سبک خرامی، یہی بندھنوں سمیت اوپر اٹھنے کی کیفیت، آفاقیت کہلاتی ہے۔ ایک ادب پارہ دراصل ارضیت سے آفاقیت تک کا ایک سفر ہے اور جو ادیب ان دونوں حدوں کے درمیان سفر نہیں کر سکتا یعنی یا تو ارضی سطح پر رک جاتا ہے یا ارضی سطح کو مس کئے بغیر آفاقیت کی باتیں کرتا ہے وہ یا تو "چھا چانی" والی شاعری خلق کرتا ہے یا کسی نظریاتی مینی فیسٹو کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے"

(تنقید و مجلسی تنقید 1981..... صفحہ 131)

○

"دوہے کی ایک اپنی فرہنگ اور ایک اپنا کلچر ہے جو اس برصغیر کے ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے ماضی کا ثمر بھی ہے اور مظہر بھی۔ شاید ہی کوئی شعری صنف بیک وقت اتنی رجعت پسند اور جدیدیت نواز ہو جتنی کہ دوہے کی صنف جو اپنے قدیم لہجہ اور مزاج سے دست بردار ہوئے بغیر جدید دور کے لہجہ اور مزاج کو خود میں سمونے پر ہمہ وقت مستعد دکھائی دیتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس ساز کو بجانے کے لئے کوئی ایسا مغنی آئے جو قدیم کی ساری غنائیت کو جدید کے آہنگ سے ہم رشتہ کرنے پر قادر ہو جائے تاکہ کبیر اور تلسی داس کی روایت بیسویں صدی کے جہاں گرد موسیقاروں کی روایت سے ہم آہنگ ہو جائے مراد یہ کہ ایسا پل تعمیر ہو سکے جس کا ایک قدم قدیم کی انگنائی میں ہو اور دوسرا جدید کے رن وے پر! (نئے تناظر..... 1981 صفحہ ---- 49)

○

"اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دستک دینے والا باہر کی دنیا میں نہیں بلکہ اندر کی دنیا میں موجود ہوتا ہے اور دستک کی آواز ہمیشہ اندر سے آتی ہے۔ ویسے بھی شاعر اور فلاسفر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فلاسفر دیکھتا ہے جب کہ شاعر سنتا ہے۔ فلاسفر کی دنیا نور اور شعور کا وہ جہان ہے جس میں اجالے کو تیرگی سے، سچ کو جھوٹ سے اور مثبت کو منفی سے ممیز کرنا ممکن ہے۔ مگر روشنی میں ایک یہ نقص ہے کہ جیسے ہی اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آئی مثلاً کوئی دیوار تو اس نے اس رکاوٹ میں سے گزرنے کے بجائے اسے عبور کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً دیوار کے ساتھ سایہ دیوار نمودار ہو گیا۔ اور شخص کے ساتھ اس کا SHADOW منتج ہو گیا۔ دوسری طرف آواز کی یہ کیفیت ہے کہ یہ رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جب گھر کے کسی کمرے میں بلب جل رہا ہو تو روشنی اس کمرے تک ہی محدود رہتی ہے۔ لیکن اگر گھر میں ریڈیو بج رہا ہو تو پورا گھر بلکہ پورا محلہ اس سے مستفیض ہوتا ہے۔ گویا روشنی تضادات کو نشان زد کرتی ہے۔ جبکہ آواز یکجائی بلکہ یکتائی کا احساس دلاتی ہے۔ تہذیبوں کے ضمن میں دیکھئے کہ ٹائن بی کی اکیس تہذیبوں کی کہانی کے مقابلے میں اب صرف دو تہذیبوں کا ذکر ہونے لگا ہے۔ یعنی سماعت کی تہذیب اور بصارت کی تہذیب! (دائرے اور لکیریں 1986 ..... صفحہ 75)

○

"تخلیقی عمل کے سلسلے میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ بظاہر اس موقف کا ایک حصہ ہے جو انہوں نے عارفانہ تجربے کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ مگر اس کا سارا کریڈٹ اقبال نے جس طرح شعری جمالیاتی تجربہ کے اعماق میں جھانکا ہے اس سے اقبال کو نقد الادب کے میدان میں ایک ایسی حیثیت حاصل ہوئی ہے جس کا تاحال پوری طرح ادراک نہیں کیا گیا۔

اقبال تخلیقی عمل کے دوران خارج سے منقطع ہوئے بغیر "اندر" کی لا محدود اور بیکنار کائنات تک رسائی کیلئے لفظ اور زبان کو ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں گویا ان کے مطابق فن کی "معراج" کیلئے لفظ کی حیثیت ایک براق کی سی ہے مگر یہ براق ایک مقررہ حد سے آگے جا نہیں سکتا۔ اقبال تخلیقی عمل کے اس سیال لمحے کی (جو نور اعلیٰ نور کی تمثیل ہے) نہایت سے واقف ہیں لہٰذا اس میں جذب ہونے کے بجائے اس سے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس سے اکتساب نور کرتے ہیں اور پھر اسی نور کی لفظ یا زبان میں تجسیم کرکے ایک فنی تخلیق میں ڈھال دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اقبال تخلیق کے "داخلی مواد" تک پہنچنے کیلئے بھی لفظ کو استعمال کرتے ہیں اور اس لاوے کی تجسیم اور ترسیل کیلئے بھی

لفظ ہی کو بروئے کار لاتے ہیں"۔
(تنقید اور جدید اردو تنقید 1989 صفحہ 181.....187)

○

"انشائیہ پر ایک یہ پھبتی بھی کسی گئی ہے کہ انشائیہ نگار جھک کر ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ پس منظر اس پھبتی کا یہ ہے کہ اس نے انشائیہ فہمی کے سلسلے میں ابتداً جو مضامین تحریر کئے ان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ انشائیہ سامنے کی چیزوں یا مناظر کو نئے زاویے سے دیکھنے کا نام ہے۔ اس کیلئے یا تو وہ چیزوں اور مناظر کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے تاکہ ان کے چھپے ہوئے پہلو نظر کے سامنے آجائیں یا پھر خود اپنی جگہ سے ہٹ کر ان چیزوں اور مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ موخر الذکر بات کو میں نے کئی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی جن میں ایک مثال بچپن کے اس تجربے سے لی جب لڑکے بالے کھیل کود کے دوران جھک کر ٹانگ میں سے منظر کو دیکھتے ہیں اور یوں انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر انوکھا نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے دوسری مثال دریا کے کنارے کے سلسلے میں دی اور کہا کہ اگر آپ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو دیکھنے کے عادی ہیں اور آپ کو ہر روز ایک ہی اکتا دینے والا منظر نظر آتا ہے تو آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جا نکلیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں تو آپ کو سارا منظر ایک نئے روپ میں نظر آئے گا۔ لہٰذا انشائیہ "دوسرے کنارے" سے دیکھنے کا نام ہے۔ مراد یہ کہ ہم عادت اور تکرار کے دائرے سے باہر آئیں۔ شخصیت کی آہنی گرفت سے آزاد ہوں اور خود پر سے معاشرتی دباؤ کو ہٹا دیں تو ہمیں ہر شے ایک نئے تناظر میں نظر آئے گی اور اس کے چھپے ہوئے مفاہیم ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ یہ عمل ہمیں سوچ کی غذا مہیا کرے گا۔ اور ہمارے اندر کی اس "حیرت" کو جگائے گا جس کے بغیر ادب کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اعصابی تناؤ کا شکار ہیں جو معاشرتی، نظریاتی اور اخلاقیاتی دباؤ کا نتیجہ ہے اور انسان کو ایک تنگ دائرے میں مقید رکھتا ہے۔ انشائیہ نگار جب انشائیہ لکھتا ہے تو وہ خود بھی اس اعصابی تناؤ سے آزاد ہوتا ہے اور اپنے قاری کو بھی "آزاد" ہونے کی راہ دکھاتا ہے "آزادہ روی کا یہ عمل انشائیہ کا محرک بھی ہے اور اس کا ثمر شیریں بھی۔ وہ لوگ جو بھاری بھرکم لبادوں میں ملبوس ہیں۔ جنہوں نے خود کو معاشرتی اور اخلاقیاتی پابندیوں میں کچھ زیادہ ہی محبوس کر رکھا ہے، وہ نہ تو انشائیہ لکھنے پر ہی قادر ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں انشائیہ سے لطف اندوز ہونے کی سعادت ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگ جو ہمہ وقت اپنی دستار کو سنبھالنے

وزیر آغا ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے حرف سپاس کا اعزاز وصول کرتے ہوئے ساتھ میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔۔

کے شبھ کام پر مامور ہیں' ان کے لئے جھک کر ٹانگوں میں سے منظر کو دیکھنا یا درخت پر چڑھ کر اس پر ایک نظر ڈالنا یا پھر ہر روز کے دیکھے بھالے کنارے کو چھوڑ کر دوسرے کنارے پر جا نکلنا ناقابل برداشت ہے۔ وجہ یہ کہ وہ "آزاد" نہیں ہیں۔ وہ دراصل اس اعصابی خوف میں مبتلا ہیں کہ زمانہ انھیں دیکھ رہا ہے۔ اگر انھوں نے بنی بنائی کھائیوں سے باہر آنے کی کوشش کی تو زمانہ ان کا مذاق اڑائے گا یا انھیں سزا دے گا۔ لہٰذا وہ جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر ساری زندگی لکیر کے فقیر بن کر گزار دیتے ہیں۔ انشائیہ دراصل زنگ آلود معاشرے پر سے زنگ کو کھرچنے کا نام ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کو اپنے معمولات سے اوپر اٹھنے کی تحریک ملتی ہے اور عادت اور تکرار کے زندان سے باہر آنے کا موقع عطا ہوتا ہے۔"

("انشائیہ کے خدوخال" 1990ء----ص۔ 88'89)

○

"بحیثیت مجموعی ساختیہ کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ ساختیے کے دو چہرے ہیں ایک وہ جو باہر کی طرف ہے اور دکھائی دیتا ہے دوسرا جو اندر کی طرف ہے اور نظر نہیں آتا مگر جس کی موجودگی کا علم ظاہر چہرے کی کارکردگی سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ساختیہ کا ظاہر چہرہ رشتوں کا ایک جال ہے جس میں اشیاء ہمہ وقت ایک دوسری سے جڑتی اور الگ ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً کلچر کی سطح پر شادی بیاہ کی رسوم' صلح و پیکار کے مظاہر' گفتگو کے پیرائے' کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب وغیرہ۔ یہ سب کارکردگی یعنی PERFORMANCE کے تحت شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ کارکردگی ایک خاص سسٹم 'کوڈ' یا گرامر کے تابع ہوتی ہے جو ساختیہ کا مخفی چہرہ ہے۔ یہ مخفی چہرہ ظاہر چہرے کے رشتوں ہی کا ایک تجریدی روپ ہے۔ سوشیور نے اسے زبان (LANGUE) کہا تھا اور اس کے عملی اظہار کو گفتار (PAROLE) کا نام دیا تھا۔ دراصل مخفی چہرہ بجائے خود ایک سسٹم یا کوڈ ہے جو دو طرح کے رشتوں پر مشتمل ہے ان میں سے ایک رشتہ تو اختلاف اور تضاد کا ہے جسے BINARY OPPOSITION کہا گیا ہے اور جس کے تحت متبادل اشیاء میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے (اسے سوشیور نے ASSOCIATIVE اور بعد والوں نے SYNTAGMATIC کا نام دیا ہے)۔ ایک مثال سے ان دونوں کے فرق کو بآسانی گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب آپ کسی ریستوران میں کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو ویٹر آپ کے سامنے مینو (MENU) لا کر رکھ دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کھانے کی دو مدیں (CATEGORIES) ہیں ایک اوپر سے نیچے اور دوسری بائیں سے دائیں! پہلی فہرست میں کھانے کی مختلف اقسام درج ہیں مثلاً سوپ' چاول' سالن' میٹھا وغیرہ۔ یہ SYANTAGMATIC فہرست ہے جس میں مختلف کھانے جڑ کر ایک SEQUENCE بناتے ہیں بائیں سے دائیں طرف لکھی گئی فہرست میں کھانے کی ہر قسم کے سامنے اس کے متبادل نمونے درج ہیں مثلاً "سوپ" کے سامنے ٹماٹو سوپ' کارن سوپ' مرغ سوپ وغیرہ۔ آپ کو ان میں سے کسی ایک سوپ کا انتخاب کرنا ہے یہ PARADIGMATIC فہرست ہے جو انتخاب کی بنیاد پر استوار ہے۔ زبان کا سٹرکچر اسی سے مشابہ ہے کیونکہ اس میں ایک خط الفاظ کے باہمی فرق کو اجاگر کرتا ہے جب کہ دوسرا خط ان کی باہمی یکجائی کو۔ یوں زبان SELECTION اور COMBINATION کے دوگونہ عمل سے مرتب ہو کر ایک ساختیہ بناتی ہے۔ ساختیہ تضاد اور اشتراک کا ایک یہ در یہ اور دائرہ در دائرہ نظام ہے جسے اگر ہاکی کے کھیل سے تشبیہ دیں تو بات شاید آئینہ ہو جائے۔ ہاکی کے کھیل میں کھلاڑیوں کی پوزیشن ہمہ وقت تبدیل ہوتی رہتی ہے مراد یہ کہ وہ گیند کی رفتار اور جہت کی مناسبت سے ہر دم تضاد اور اشتراک کے رشتوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ مگر ہاکی کے کھیل کا یہ منظرنامہ ہاکی کے کھیل کے قواعد و ضوابط کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ کھیل کے دوران جب کوئی کھلاڑی کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ریفری سیٹی بجا کر کھیل روک دیتا ہے۔ کھیل کے دوران ہاکی کے کھلاڑی جس متحرک پیٹرن کو وجود میں لاتے ہیں۔ وہ اصلاً رشتوں کا ایک جال ہے تاہم یہ پیٹرن اس ضابطے کے مطابق ہی اپنی صورتیں بدلتا ہے جو بطور ایک گرامر' کوڈ یا سسٹم ہر کھلاڑی کے ذہن میں نقش ہوتا ہے۔ زبان کو لیجئے اس کی گرامر ہمارے اعماق میں موجود ہے اور ہم گفتگو کے دوران قطعاً غیر شعوری طور پر اس گرامر کے مطابق ہی ترسیل کے ہزار پیکر ہمہ وقت تراش رہے ہوتے ہیں لہٰذا کارکردگی یعنی PERFORMANCE کا عمل متنوع' تغیر پذیر اور پیچیدہ عمل ہے اور لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ تر ہوتا جاتا ہے جب کہ دوسری طرف اس کے پس منظر میں موجود سسٹم چند مستقل نوعیت کے بنیادی اوصاف سے عبارت ہوتا ہے۔" (ساختیات اور سائنس۔ 1991ء صفحہ 245۔247)

○

"اس آخری نظم "ہر جا نب تیں" میں مجید امجد نے ایک ایسی انتہائی لطیف روحانی کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں "موجودگی" کے دونوں چہرے یکجا ہو کر ایک چہرہ بن گئے ہیں جہاں امید اور خوف چپوار بن کر اس کی کشتی کو کھینچنے لگے ہیں اور وہ خود کو "ہونے" اور "نہ ہونے" کے اس عالم میں پانے لگا ہے جو زمان و مکان' زمین اور آسمان کی دوئی سے ماورا تو ہے مگر "ناموجود" نہیں ہے

یعنی ایک ایسا عالم جسے ہیئت یا فارم کا نام ملنا چاہیئے۔ واضح رہے کہ آرکی ٹائپ یا علامت کی طرح فارم (FORM) بھی اندر سے خالی ہوتی ہے مگر "ناموجودگی" کی حامل نہیں ہوتی لسانیات میں زیرو فونیم (ZERO PHONEME) کا جو تصور ملتا ہے وہ اس فارم ہی سے مشابہ ہے جس کی کوئی مقررہ صوتی قیمت یعنی PHONETIC VALUE تو نہیں ہوتی تاہم جسے عدم موجود بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ریاضی میں "صفر" فارم کے اس خاص وصف ہی کی حامل ہے کہ وہ "کچھ نہ ہونے" کے باوجود "عدم" نہیں ہے بلکہ اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتی ہے۔ اس کی ایک اپنی "موجودگی" ہے جو دائروی ہونے کے باعث INFINITE ہے مگر اندر سے خالی ہونے کے باعث کسی "مقررہ معنی" کے تابع نہیں بلکہ معانی کی تخلیق کا باعث ہے۔ مجید امجد اپنی زندگی کے آخری ایام میں "صفر" کے اسی عالم میں ایستادہ دکھائی دیتا ہے جہاں وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے "میں ہوں" کے الہامی الفاظ اس کیفیت ہی کو اجاگر کرتے ہیں جسے ویدانت نے "اہم برہم" کا نام دیا تھا۔ مگر مجید امجد نے کسی فلسفیانہ رویے کا اظہار نہیں کیا۔ فقط اپنے شعری تجربے کو "عجز اظہار" کی دھند میں ملفوف کر کے "اظہار" کا وسیلہ بنایا ہے اور یہ ایک بہت بڑا شعری کارنامہ ہے! (مجید امجد کی داستان محبت: 1991)

موودی عبد الحق سیمینار نئی دہلی بھارت۔۔۔ نصیر احمد ناصر سے محو گفتگو

کھلی فضاؤں کی شاعری

اکبر حمیدی

کسی نے کہا تھا اگر آپ روم میں رہ رہے ہیں تو اس طرح سے رہیں جیسے رومن رہ رہے ہیں۔ اس جملے کے کئی ایک معنی ہیں مگر شعر و ادب کے حوالے سے میں اس جملے کے یہ معنی سمجھتا ہوں کہ اہل قلم کو اپنے معاشرے اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے معاملات و مسائل میں شریک ہونا چاہیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئی تخلیق اپنے عصر سے بیگانہ نہیں رہ سکتی۔ یہ درست سہی مگر ایسی معاصرانہ تخلیق کا کیا فائدہ جس میں عصری شعور چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے اور بسا اوقات اپنی جیب سے ڈالنا پڑے۔ خصوصاً ہمارے جیسے روم کو اور ہمارے جیسے رومنوں کو اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ ان کے تخلیق کار انکے دکھوں میں شریک ہوں اور خود غرض ارباب بست و کشاد کو ان کے معاملات و مسائل کی سنگینی کا احساس دلا میں تیز استحصالی قوتوں کے بڑھتے ہوئے خونی پنجوں کو روکنے اور مروڑنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ وطن عزیز میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر ہمارے شاعروں' ادیبوں اور دانشوروں نے اس پر خاموشی اختیار کئے رکھی اور اپنے اپنے فکر و فلسفے بگھارتے رہے جن کے بگھارنے کا یہ موقع نہیں ہے تو پھر کل کا مورخ لکھے گا کہ روم جل رہا تھا اور نیرو شہر سے باہر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا!

وزیر آغا کا شمار میں ان صف اول کے شاعروں میں کروں گا جنہوں نے بحیثیت شاعر کے ساری زندگی اپنے رومنوں کے ساتھ بسر کی ہے اور ان کے دکھوں سکھوں میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ وزیر آغا کے بارے میں بے شمار غلط باتیں پراپیگنڈہ کے ذریعہ پھیلا دی گئی ہیں تاکہ ملک کا باشعور طبقہ انہیں ناپسند کرتا رہے۔ مثلاً کہا گیا کہ وہ دائیں بازو کے آدمی ہیں۔ وہ ادب میں عصری مسائل کے اظہار کو مسترد کرنے والوں میں شامل ہیں۔ بعض حضرات نے تو انہیں 'بنیاد پرستوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔ وزیر آغا نے چونکہ خصوصاً شاعری۔ انشائیہ اور تنقید و تحقیق میں بڑا کام کیا ہے جو مقدار اور معیار ہر دو لحاظ سے صف اول کا ادب ہے اس لئے بعض حضرات نے وزیر آغا کا وزیر آغا ہی سے موازنہ کر دیا۔ کسی نے انہیں بڑا نقاد تسلیم کر کے گفتگو ختم کر دی۔ کسی نے بڑا نظم گو شاعر کہا اور پھر خاموش ہو گئے اور کسی نے بڑا انشائیہ نگار کہا اور یوں سب نے وزیر آغا کو کسی ایک کھاتے میں ڈال کر فارغ ہو جانا چاہا ---------- ظاہر ہے یہ رویہ کسی طرح بھی منصفانہ نہیں ہے۔

وزیر آغا اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور تخلیقی زندگی میں بھی بیحد روشن خیال۔ لبرل۔ سیکولر اور سائنٹفک نقطۂ نظر رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ میٹا فزکس کو ایسی فزکس سمجھتے ہیں جس کو انسان ابھی سمجھ نہیں پایا۔ یہی نہ سمجھ پانا انسانی حیرت کا باعث ہے وہ شاعری میں عصری شعور کے اظہار کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان کی شاعری ان مسائل و معاملات سے بھری پڑی ہے۔ وزیر آغا کے بارے میں ایک بات اور پھیلائی گئی کہ وہ ترقی پسند تحریک کے شدید مخالف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہاں بھی وزیر آغا کے ناقدین کو غلط فہمی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وزیر آغا ترقی پسند تحریک کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ادب میں اسی تحریک کے فعال اور مثبت کردار کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے اور اس وقت بہت سے ترقی پسندانہ خیالات رکھنے والے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک بھی دوسری تمام تحریکوں کی طرح اپنا کردار ادا کر کے ختم ہو چکی ہے۔ یہ بات یہاں خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ دنیا کی کوئی تحریک ہمیشہ زندہ نہیں رہتی۔ اس لئے کہ ہر تحریک اپنے عہد سے جنم لیتی ہے پھر عہد آگے نکل جاتا ہے اور تحریک

وہاں کھڑی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں ترقی پسند تحریک کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال یعنی 1992ء کے کسی "اوراق" میں جناب جوگندر پال کا ایک مضمون دیکھا جا سکتا ہے جو انہوں نے قمر رئیس صاحب کے حوالے سے لکھا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق ہے وہ ترقی پسند تحریک کو جدیدیت کا ایک حصہ خیال کرتے ہیں اور جدیدیت کو آج کے پورے انسان کی نمائندہ!!

وزیر آغا کو ان کے مخالفین نے گزشتہ ربع صدی سے کسی آئیوری ٹاور میں رہائش رکھنے والا تخلیق کار قرار دے رکھا ہے جو اپنے عہد سے آنکھیں بند کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور یوں اپنی طرف سے انہوں نے وزیر آغا کو ٹھکانے لگا دیا ہے! یہ کیسی عجیب بات ہے!!

گزشتہ برسوں میں وزیر آغا نے جو تین طویل نظمیں (1) آدھی صدی کے بعد (2) زمین (3) اک کتھا انوکھی" لکھی ہیں ان نظموں نے اردو نظم کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے یہ تینوں نظمیں کسی نہ کسی طرح زندگی اور انسانی زندگی کے المیوں کا اظہار ہیں مگر خصوصیت سے "اک کتھا انوکھی" تو عالمی منظر نامے میں انسانیت کا مرثیہ معلوم ہوتی ہے۔ انہی المیوں کا اظہار وزیر آغا کی غزلوں میں ہوتا ہے اتنے پھیلے ہوئے تخلیق کار کے لئے کسی ایک صنف پر جم کے کام کرنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ وہ سب حضرات لگا سکتے ہیں جو ایک سے زیادہ اصناف میں لکھ رہے ہیں۔

تاہم مخالفت کے باوجود وزیر آغا کی شاعری کا اعتراف بھی گزشتہ سات برسوں میں بہت ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ سات آٹھ یا دس برسوں میں وزیر آغا کی شاعری جو سامنے آئی ہے وہ مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو نظم کے ممتاز شاعر اور میرے دوست اختر حسین جعفری جب بھی آزاد نظم کے بڑے نام گنواتے تو وہ نام ہمیشہ میرا جی۔ مجید امجد۔ ن۔ م۔ راشد اور وزیر آغا کے نام ہوتے۔ یہ بات کئی مرتبہ جعفری صاحب نے تحقیق کے ساتھ کہی کہ وزیر آغا بلا شبہ جدید اردو نظم کا بڑا نام ہے۔ جعفری صاحب کا حوالہ خصوصیت سے میں اس لئے دے رہا ہوں کہ جعفری صاحب ادبی سیاست بندی میں اکثر وزیر آغا کے مخالف کیمپ میں شمار ہوتے ہیں۔"

بات شاید کچھ پھیل گئی ہے مگر اسے پھیلنا ہی تھا۔ یہ ساری تفصیلات بیان کرنے کا مقصد وہ غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش ہے جو وزیر آغا کے بارے میں جہاں تہاں بیان کر کے پھیلا دی گئی ہیں۔ میرا دوسرا مقصد اس مضمون کے ذریعے اپنے بیان کردہ حوالوں سے وزیر آغا کی غزل پر اظہار خیال ہے۔

1991ء میں وزیر آغا کی کلیات "چٹک اٹھی لفظوں کی چھاگل" شائع ہوئی جس میں ان کی نظموں کے علاوہ ان کی تمام غزلیں بھی شامل ہیں۔ یوں ہمارے لئے وزیر آغا کی غزل پڑھ کر اس کے بارے میں ایک تاثر بلکہ مجموعی تاثر قائم کرنا آسان ہو گیا ہے۔ اسی طرح اب وزیر آغا کی غزلوں پر ایک تفصیلی رائے بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں وزیر آغا کی غزل کی چند خصوصیات کا میں ذکر کروں گا۔

اس سے پہلے کے پھیلے ہوئے تاثر کے برعکس میں نے محسوس کیا ہے کہ وزیر آغا کی غزل اپنے عہد کی سخت گیر نقاد ہے جس میں فریاد کا سا لہجہ جھلکتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت شاعر کے وہ ملکی معاملات سے کس قدر جڑے ہوئے ہیں اور وہ ان معاملات کی خرابیوں پر کس قدر دل گرفتہ ہیں چند اشعار دیکھئے ؎

خنک شامیں کبھی ایسے تو نہیں چیختی ہیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا

ہر ایک پیڑ ہے منقار زیر پر اب تو
وہ شام کیا ہوئی جب ہر شجر چہکتا تھا

شجر پہ پھول تو آتے رہے بہت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا اس کا بے ثمر رہنا

اس نخل نامراد سے جو پات جھڑ گئے
اندھی خنک ہواؤں کے اب کام آئیں گے

کبھی گلے نہ لگایا مجھے مگر پھر بھی
طواف کرنے پڑے شہر بے ثمر کے مجھے

پھول مہکے لہو کے سڑکوں پر
بین کرنے لگی ہیں مائیں مگر

یہ غزل پوری کی پوری غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے ؎

مدارات دوستاں

شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
پنچھی ہم کو جالی والے سبز کھلونے لگتے ہیں

اس شعر پر تو کوئی بھی تبصرہ نہ کیا جائے تو بھی ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ اس قوم کے بارے میں ہے جس کے افراد نے خود ہی اپنی کشتی ڈبوئی تھی۔ پاکستانی قوم کے افراد کی اجتماعی بد اعمالیوں پر اس سے بڑا شعر شاید ہی اردو غزل میں ملے گا ۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے موجوں کا سر جھک جاتا ہے
اور کشتی کو کشتی والے آپ ڈبونے لگتے ہیں

یوں اس موضوع پر وزیر آغا کی غزلوں میں بہت اشعار مل جائیں گے مگر میں صرف دو شعر یہاں درج کرتا ہوں ۔

اس یخ ہوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے
اپنے ہی گھر میں بے در و دیوار ہم بھی تھے

اور خصوصاً یہ شعر ۔

کس گھنے جنگل میں جا کر اب چھپیں اہلِ وطن
آنکھ سی ابھری ہوئی سورج کی پیشانی میں ہے

آج کی غزل کو پڑھ کر جو ایک تاثر سا ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے شاعر بند کمرے کی شاعری کر رہے ہیں۔ چھوٹی سی فضا۔ محدود سے الفاظ۔ چند ایک خیالات۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے امیجز دیکھنے میں کم آرہے ہیں۔ محاکات کی شاعری کا تصور ناپید سا ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب باتوں کے برعکس وزیر آغا کی غزل کھلی فضا کا منظر پیش کرتی ہے جس میں زمین ہے۔ سبزہ ہے گھاس ہے۔ شبنم ہے۔ سورج۔ بادل۔ ہوا۔ برسات۔ درخت۔ پرندے۔ ان کی آوازیں اور پوری ایک دنیا آباد ہے۔ یہ دنیا ہماری آج کی غزل میں شاید ہی کہیں اور ملے گی۔ اسی طرح وزیر آغا کی غزلوں میں خوبصورت امیجز بناتے ہوئے اشعار جابجا ملیں گے۔ دیکھئے ۔

کس کی آواز میں ہے ٹوٹتے پتوں کی صدا
کون اس رُت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

دیکھا جو ریگ زارِ قمر سے تو میرا گھر
آبِ رواں پہ بہتا ہوا اک گلاب تھا

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہئے
ہر طرف پھولوں کا سونا ہے یہاں بکھرا ہوا

ہم نے بھی دیکھے ہیں آواز کے اُڑتے ہوئے رنگ
کوئی آنسو اُٹھے جب چھیڑ رہا ہوتا ہے

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا

اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

اسکا تھا بدن تھا خون کی حدّت سے شعلہ وش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

شبنمی گھاس گھنے پھول لرزتی کرنیں
کون آیا ہے خزانوں کو لٹانے والا

زندگی اک لہو کا چھینٹا ہے
عمر زخموں کی دیپ مالا ہے

جاتے جاتے شام یک دم ہنس پڑی
اک ستارا دیر تک رویا کیا

شاید کہ تو نے کھول دی مٹھی بھری ہوئی
طشتِ فلک میں نقرئی سکے بکھر گئے

وزیر آغا کی غزل میں کہیں کہیں ایک ایسا صوفی جھلک دکھاتا ہے جسے خالق کائنات سے اور سب سے زیادہ اس کائنات میں رہنے والے انسانوں سے محبت ہے۔ وہ ان انسانوں کو دکھوں میں مبتلا دیکھ کر دکھی ہو جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

رنگ اور روپ سے جو بالا ہے
کس قیامت کے نقش والا ہے

رات بھر کہکشاں کی مالا میں
دانہ دانہ تجھے شمار کیا

پتّی پتّی ہوئے ہیں پھول تمام
پھر بھی خاموش پھول والا ہے

چاندنی اُس کے تن کی اترن ہے
سبز شبنم گلے کی مالا ہے

خصوصیت سے یہ شعر دیکھئے بلا تبصرہ اس اعتماد کے ساتھ کہ میرا قاری شعر کو دور تک سمجھتا ہے۔

اس شہرِ ناسپاس کو تُو نے سزا تو دی
کیا شہر کے تمام مکین ناسپاس تھے؟

ہمارا روایتی صوفی عالم بالا کو اپنا اصل گھر کہتا چلا آیا ہے۔ جبکہ وزیر آغا اسی دنیا کو اپنا گھر قرار دیتے ہیں۔ اس سے آپ وزیر آغا کی شخصیت اور ان کے نظریات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دو اشعار دیکھئے ؎

دیکھا جو ریگ زارِ قمر سے تو میرا گھر
آبِ رواں پہ بہتا ہوا اک گلاب تھا

بُھلا نہ دینا مجھے جب میں اپنا گھر چھوڑوں
بچا کے میرے لئے بھی کوئی دعا رکھنا

ایک اور ——

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ زمیں بے لباس تھی

وزیر آغا کی نظریاتی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک شعر اور

سر سے اتارے برف کی دستار کس طرح
بوڑھے سے اک پہاڑ کی صورت اکڑ رہے!

ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری اور غزلیہ شاعری میں بہت سی باتیں ہیں جن کا تعلق فہم و فراست اور سوچ سمجھ یا عقل و شعور سے ہے اور جو انسانی زندگی کو محفوظ بھی اور خوبصورت بھی بنا سکتی ہیں۔ یوں وزیر آغا ایک دانشور بلکہ

دانشمند شاعر کے طور پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی لمحوں کے مجموعے ہی کا نام ہے مگر بعض اوقات جب ایک لمحہ بے مہار ہو جاتا ہے تو وہ پوری زندگی کو روند کر اور اس پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کو خیریت سے گزار لینا بہت بڑا کام ہے۔ وزیر آغا نے اس فلسفیانہ اور حکیمانہ مضمون کو بڑی آسانی سے ادا کیا ہے۔ دیکھئے ۔

ایک لمحہ اگر گزر جائے
دوسرا تو گزر ہی جائے گا

ایسے ہی دو چار اشعار اور دیکھئے ۔

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

اس بے وفا سے قطعِ تعلق کی دیر تھی
جینا بھی اور مرنا بھی آسان ہو گیا

وزیر آغا کی غزل میں بعض اشعار ایسے ملیں گے جو اتنے نرم و نازک ہیں کہ ہم انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے مگر قریب کھڑے ہو کر ان کی معنوی جلوہ سامانیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو سکتے ہیں۔ ذرا دیکھئے ۔

ایک مدت کے بعد ہم آخر
اپنے اور اس کے درمیان پہنچے

ساگر میں نہیں تھی موج اک بھی
ساحل تھا کہ پھر بھی کٹ رہا تھا

جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کے

دل کہ ہے راستے کا اک پتھر
آؤ اس کوہِ غم کو پار کریں

یوں تو غزل اپنے خالق کی شخصیت کو بڑی وضاحت سے بیان کرتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ غزل اپنے خالق کی باطنی تصویر ہوتی ہے۔ جو کچھ کوئی غزلوں میں کہہ رہا ہے وہ خود دراصل وہی کچھ ہے۔ پھر بھی بعض اشعار میں یہ تصویر بہت واضح ہو جاتی ہے یا اس تصویر کا کوئی ایک رخ بہت واضح ہو کر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ مثلاً ان اشعار میں وزیر آغا کی شخصیت کی ایک جھلک دیکھئے ۔

لڑھکتے ہوئے پتھروں کو بتاؤ
ہمالہ جہاں تھا وہیں پر کھڑا ہے

میں گھمسر ہوں کہ ہمسفر ہو مرا
وہ بھنور ہے کہ گھر ہی جائے گا

ہوا کے ساتھ نکلوں گا سفرؔ کو
جو دی مہلت مجھے میرے خدا نے

ورق ورق نہ بہی عمر رائیگاں میری
ہوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا

مضمون کا آغاز میں نے اس محاورے سے کیا تھا کہ اگر آپ روم میں رہ رہے ہیں تو اس طرح رہئے جیسے رومن رہ رہے ہیں یہ درست ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک روم ہمارے اندر بھی آباد ہے جہاں ہم اپنے محبوب رومنوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ زندگی بہت ہی میٹھی اور پر لطف ہے جہاں ہم اپنے نرم و نازک جذبات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وزیر آغا کے باطن میں بھی ایک روم بسا ہوا ہے جہاں وہ اپنے محبوب رومنوں کے ساتھ زندگی کے پر لطف روز و شب بسر کر رہے ہیں۔ اس روم اور اس میں وزیر آغا کے محبوب رومنوں کی جھلکیاں دیکھئے ------ اور پھر ان جذبوں کا اندازہ کیجئے جو وزیر آغا اپنے اندر کے رومنوں کیلئے رکھتے ہیں ۔

اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ وش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

بدن میں اُس کے فروزاں تھا کیا کہ وقتِ سحر
تمام دیپ بجھے تھے مگر وہ جلتا تھا

اُس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پروبال اسی کے

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا
رات بھر باغ میں گل بن کے مہکنے والا

اُس موجۂ لباس کی خوشبو سے سارا شہر
گل ریز ہو کے اور بھی گنجان ہو گیا

میں ایک تنکا رکا کھڑا تھا ندی کنارے
ندی نے بہنا مجھے سکھایا تو میں نے جانا

چپ رہوں اور اُسے ملال نہ ہو
اَن کہی کا تو ایسا حال نہ ہو

جال پھینکیں کبھی اس کالی گھٹا میں ہم بھی
اور پھر جال میں بجلی کا تڑپنا دیکھیں

ہم نے بھی ساری عمر کیا خود کو تار تار
اپنے بدن میں کند سی تلوار ہم بھی تھے

ساگر میں نہیں تھی موج اک بھی
ساحل تھا کہ پھر بھی کٹ رہا تھا

وزیر آغا کی غزل وزیر آغا کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے گزشتہ آٹھ دس برسوں میں جس قدر وزیر آغا کی شاعری پر لکھا گیا ہے اتنا کسی اور شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ دوسری بات یہ کہ ابتک وزیر آغا کی غزل کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ایسا ہونا قرین قیاس بھی تھا اس لئے کہ ان کی نظم نے اتنی توجہ لی کہ غزل نظرانداز ہوتی رہی۔ یوں بھی وزیر آغا نے کم سے کم تین اصناف یعنی شاعری۔ انشائیہ اور تنقید میں مضامین نو کے انبار لگا دیئے ہیں اور ان انبار کا جائزہ لینا اب ایک ادارے کا کام ہے یا پھر کسی ایسے بڑے نقاد کا کام ہے جو اپنے آپ کو وزیر آغا کیلئے مخصوص کرلے اور اس کام کو بڑی سنجیدگی سے اور عزم و استقلال سے کرتا چلا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اہل قلم کو اب ہر قسم کی مصلحتوں اور مفاہمتوں سے قطع نظر کرکے اور ہر طرح کے تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر کام کرنے والوں کا نہ صرف اعتراف کرنا چاہیئے بلکہ ان کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھنی چاہیئے۔ وزیر آغا صاحب طرز غزل گو ہیں اور ان کی غزل اپنے انداز فکر اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اپنی پہچان کرواتی ہے اور یہی کسی تخلیق کار کی بھی پہچان ہے۔

وزیر آغا نے اپنی غزل کے ذریعے نہ صرف انسانی نفسیات کی بوقلمونیوں کو پیش کیا ہے۔ گہرے اور پھیلے ہوئے دانشورانہ عمق دیئے ہیں عصری شعور کی ایک بلند تر سطح سے روشناس کروایا ہے بلکہ جدید اردو غزل کو پنجاب کی کھلی سر سبز و شاداب فضاؤں کا لشکارا۔ مہکتا اور پرندوں کی آوازوں سے چہکتا پس منظر بھی عطا کیا ہے۔ اس لئے میں وزیر آغا کو ان رہنما شاعروں کی صف میں جگہ دوں گا جنہوں نے اردو غزل کو کھلے آسمانوں تلے نئی منزلوں کی طرف رواں دواں کیا ہے۔

○

ڈاکٹر بشیر سیفی کی تحقیقی و تنقیدی کتب

اردو میں انشائیہ نگاری
(تاریخ و تنقید)
دور سرسید سے 1986ء تک اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ و تنقید کا بے لاگ محاکمہ

خاکہ نگاری
(فن و تنقید)
پاکستان میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب جس میں 1985ء تک لکھے گئے خاکوں کو فن خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے

شعری مجموعے

گفتار مطلع
(غزلیں۔ نظمیں۔ ہائیکو)
(اولیں مجموعہ غزل)

اپنے قریبی بکسٹال سے خریدیئے یا براہ راست ہم سے طلب کیجئے
نذیر سنز پبلشرز 40۔ اے اردو بازار۔ لاہور

○

یوں تو ڈاکٹر وزیر آغا کے سارے انشائیے ہی ان کے مخصوص اسلوب اور فکر کی منہ بولتی تصویریں ہوتی ہیں لیکن "چرواہا" میری دانست میں ان کے نمائندہ ترین انشائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس انشائیے کی پہلی قرآت ہی قاری کو اسلوب کی تازہ کاری اور فکر کی گہرائی سے متاثر کرتی ہے۔ عہد جدید کا قاری اب اس تحریر کو پسند نہیں کرتا جس میں واقعہ کی تفصیل در تفصیل ہوتی ہے ڈکنز کے ناول اپنے زمانے میں تفصیل کاری کے سبب بہت مقبول تھے لیکن جدید ذہن اب اس طویل تفصیل کو قبول کرنے پر مائل نہیں۔ اب اس ادبی تحریر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس میں لفظوں کی بھرپور اکائی یعنی کفایت شعاری کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انشائیہ اس اعتبار سے جدید ذہن کو نہ صرف متاثر کرتا بلکہ اس کی ضرورت بھی بن جاتا ہے کیونکہ اس کی ساخت میں لفظوں کی کفایت شعاری بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ وزیر آغا کے انشائیہ چرواہا میں لفظوں کی اکائی بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ایک خوبصورت ادبی ساختیہ وہی ہوتا ہے جس میں ساختیاتی عمل کو اس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے کہ جب قاری اسے اپنی قرآت کی گرفت میں لاتا ہے تو معنی در معنی کا لامتناہی سلسلہ اس کے چشم تخیل کے سامنے نمودار ہونے لگتا ہے۔ چرواہے کی ادبی سٹرکچرنگ (Structuring) کے عمل کو اس فنی مہارت اور وجدانی شعور کے ساتھ بروئے کار لایا گیا ہے کہ ایک جہان معنی قاری کے سامنے کھل جاتا ہے کہ جسے پاکر قاری عرفان و ادراک کے نئے منطقوں میں چہل قدمی کرنے لگتا ہے۔ چرواہا اپنے ساختیاتی عمل سے ہمیں بدرجہ اتم مطمئن کرتا ہے۔

اب دیکھئے کہ مصنف کس طرح ایک معمولی ملاقات کے نتیجہ میں غیر معمولی افکار کے موتیوں سے ہمارے دامن تخیل کو بھر دیتا ہے۔ مصنف اپنے روز مرہ کے معمولات کے دوران ایک عام سے چرواہے سے ملتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے "بھائی چرواہے! تم پہاڑیوں کی مہیب تنہائی میں پہاڑ ایسا دن کیسے کاٹ لیتے ہو؟" اس پر چرواہا جواب میں کہتا ہے "کون سی تنہائی آغا جی! میرے ساتھ بھیڑیں ہوتی ہیں۔ پھر وہاں پہاڑیاں ہیں پہاڑیوں پر جھاڑیاں ہیں۔ جھاڑیوں میں چڑیاں ہیں۔ میں تنہا کب ہوتا ہوں!" لیکن اس کے جواب سے مطمئن نہ ہو کر مصنف اس سے مزید پوچھتا ہے "وہ تو ٹھیک ہے مگر وہاں نہ بندہ ہوتا ہے نہ بندے کی ذات! آخر تم باتیں کس سے کرتے ہو؟" اس پر چرواہا نہایت معنی خیز جواب دیتا ہے جو ادبی اور فکری اعتبار سے پیراڈکس (PARADOX) کی خوبصورت مثال ہے۔ "جی باتوں کا کیا ہے وہ تو میں خود سے کر لیتا ہوں۔ اپنی آواز کو سننے میں بڑا لطف آتا ہے۔" اسی جملے سے انشائیہ نگار اپنی جادو کی چھڑی سے اس معمولی بات کو غیر معمولی بات میں منتقل کر دیتا ہے۔ انشائیہ نگار کو چرواہے کے اس جملے سے فکری تحرک ملتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے۔ "واقعی تنہا وہ نہیں، ہم ہیں کیونکہ وہ تو ہمہ وقت اپنے ساتھ رہتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں وہ اپنی آواز کا خود ہی سامع ہے جب کہ ہم اپنی آواز دوسروں کو سناتے ہیں۔" یعنی "تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔" یا بالفاظ دیگر جب میں تنہا ہوتا ہوں تو تنہا نہیں ہوتا اور جب میں بھری دنیا میں ہوتا ہوں تو تنہا ہوتا ہوں اپنے آپ سے اجنبی ہونے (ALIENATE) ہونے کا نام تنہائی ہے۔ جو فرد اپنے نفس کو پہچانتا ہے وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے اور جو اپنے رب کو پہچانتا ہے وہ خاموش ہو جاتا ہے انشائیہ نگار کی جادو کی چھڑی مزید حرکت میں آتی ہے اور یہ چرواہا اب مختلف روپوں میں جلوہ گر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس چرواہے کا ارفع ترین روپ دیکھیں انشائیہ نگار نہایت فکری عمیق اور ثقافتی بصیرت کے ساتھ ہمیں انسانی تہذیب و تمدن کے تین ادوار سے روشناس کرا کے ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ پہلا دور چرواہے کا ہے جو گذر جانے کے باوجود تاحال جاری و ساری ہے دوسرا دور کسان کا ہے جو اپنی عمر طبعی گذار چکنے کے بعد اب جاں بلب ہے کیونکہ زمین اب ایک مدت سے شور کے تیزی سے پھیلنے کے سبب اپنی قوت نمو کھو رہی ہے اور تیسرا دور جو ابھی ابھی شروع ہوا ہے بنیئے کا دور ہے جس کی ساری قوت کا دارومدار زر یعنی روپیہ پر ہے۔ اس

کے سرمایہ دارانہ دور نے اپنی فیکٹریاں قائم کرنے کی غرض سے کسان کو نقل مکانی پر مجبور کرایا ہے۔ یہاں بنیا سائنس اور ٹیکنالوجی اور سرمایہ دارانہ نظام کی علامت کے طور پر ابھرا ہے۔ جو انسان کی تمام روحانی اور ثقافتی اقدار کو آہستہ آہستہ نہیں بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ نگل رہا ہے فصلوں کی جگہ شہر اگ رہے ہیں اور ہرے بھرے کھیتوں کو تس نس کرکے فیکٹریوں کا جم غفیر بس رہا ہے جس سے تمام فضا آلودگی کا شکار ہو رہی ہے کسان کی بساط کو الٹ کر بنیا خوراک زمین کے بجائے سمندر سے حاصل کرنے کی طرف لپک رہا ہے۔ انشائیہ نگار اس تمام جدید صورت حال کو عارفانہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "بنیا اپنی تمام تر قوت اور چالاکی کے باوجود چرواہے کا شاید کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کیونکہ چرواہے کی قوت زر یا زمین میں نہیں بلکہ اس کی "چھڑی" میں ہے۔" اب نہایت فنی چا بکدستی کے ساتھ انشائیہ نگار کی جادو کی چھڑی چرواہے کی معجز نما چھڑی کے ساتھ ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ چرواہے کی چھڑی "وہ چھڑی ہے جو کبھی برق بن کر لہراتی ہے۔ کبھی شبنم بن کر اترتی ہے' کبھی خیال بن کر اڑتی ہے' کبھی خوشبو کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور کبھی دوبارہ چھڑی بن کر ریوڑ کو ہانکنے لگتی ہے۔ بنیا ہزار کوشش کے باوجود اس چھڑی پر قابض نہیں ہو سکتا کیونکہ قبضہ تو صرف مرئی چیزوں پر کیا جاسکتا ہے۔" آپ نے دیکھا انشائیہ نگار نے کس خوبصورتی سے عام سے چرواہے کو غیر معمولی چرواہے میں اپنے فکر کی جادوگری سے منقلب کرایا۔ انشائیہ نگار کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے قلم کے جادو سے عام اشیاء کو حیرت انگیز طور پر غیر معمولی کیفیت میں منقلب کردیتا ہے۔ یہی چرواہا جو بھیڑیوں کو چراتا ہے پیغمبر کے روپ میں جلوہ گر ہو کر انسانوں کے ریوڑ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ لیکن کیا مجال جو انشائیہ نگار کہیں بھی لفظ پیغمبر استعمال کرے۔ پیغمبر کا لفظ استعمال کیے بغیر انشائیہ نگار ہمارے راہوار فکر کو عظیم پیغمبروں کی طرف موڑ دیتا ہے اور ہم اپنے چشم تخیل سے تمذیبی تاریخ کا عارفانہ طور پر مشاہدہ کرنے لگتے ہیں۔ یہی انشائیہ نگار کی خوبی اور کامیابی ہے۔ دیکھئے کس خوبی سے انشائیہ نگار بھیڑ بکریاں چرانے یا گائیں بھینسوں چرانے والے چرواہوں سے ہماری توجہ کو ہٹا کر ان چرواہوں کی طرف ہمارے فکر کی مہار کو موڑ دیتا ہے کہ ہم خود بخود ان عظیم پیغمبروں کا دیدار کرنے لگتے ہیں جن کے ہونٹوں پر اسم اعظم تھرکتے ہیں۔

"—— میں تو صرف ان چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مویشیوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ ہونٹوں پر اسم اعظم تھرکنے لگتا ہے۔ وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لا کر یا صحرا کے سینے میں اتار کر دریا کے کناروں پر بکھیر کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی کسکی اور پوست کو گندی اون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا ہو گیا ہے تو وہ انہیں واپس ان کے گھروں تک لے آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔ یہ جو بساط فلک پر ہر رات کروڑوں ستارے چمکتے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب اسی تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانے ہیں ؟؟"

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ انشائیہ نگار نے اپنے اعجاز قلم سے چرواہے کو ان تمام عظیم ہستیوں پر منطبق کر دیا جو بنی نوع انسان کی زندگی کے ہر گوشے میں راہنمائی کا عظیم فریضہ ادا کرتی ہیں۔ جو مرنے کے بعد بساط فلک پر روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور اپنے افکار عالیہ سے ہماری زندگی کی بساط کو آلودگی سے بچاتی ہیں۔

انشائیہ نگار کے اوصاف خاص میں ایک وصف آزادہ روی کا ہونا ہے جس سے نہ صرف وہ خود اعصابی تشنج سے چھٹکارا پاتا ہے بلکہ قاری کو بھی اعصابی تناؤ سے نجات دلاتا ہے چرواہے کا مرکزی کردار آزادہ روی کی خوبصورت مثال ہے وہ خود بھی آزادی کو پسند کرتا ہے اور اپنے ریوڑ کے گلے کو بھی آزاد چھوڑنے کا کھلا موقع عطا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے سرسبز و شاداب میدان' جھاڑیوں سے اٹے ہوئے صحرا یا کسی پہاڑ کی ڈھلوان پر آزادانہ چرنے کے عمل سے لطف اندوز ہو سکے لیکن وہ اپنے گلے کو بے محابا کھلا چھوڑ کر انہیں اس کے تشخص سے محروم بھی نہیں کرتا لہٰذا شام ہوتے ہی وہ بھیڑوں کو مجتمع کرتا ہے اور اپنے ڈیرے پر لے آتا ہے بکھرنے اور پھر جڑنے کے اس عمل سے چرواہا ہر روز گزرتا ہے جو پوری کائنات کے طرز عمل سے مشابہہ نظر آتا ہے۔

وزیر آغا کے انشائیہ چرواہا میں ہمیں جمالیاتی حظ اور فکری تسکین کا وافر سامان ملتا ہے۔ یہ انشائیہ اپنے چھوٹے سے کینوس پر لامحدود افکار کے رنگ بکھیرتا ہے۔ اپنے اسلوب کی تازہ کاری اور فکر کی شادابی میں یہ انشائیہ ان کے تمام انشائیوں میں مینار نور کی طرح جگمگا رہا ہے اور اپنے خاص سٹرکچر سے معنی کا لا مختتم سلسلہ قاری کے ذوق فکر کی تسکین کرتا ہے۔

وزیر آغا اور انشائیہ

کرنل غلام سرور

وزیر آغا نے انشائیہ کے لفظ کو "پرسنل ایسے" (Personal Essay) کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور انشائیہ کو بحیثیت ایک تحریک کے پیش کیا ہے۔ ابو الکلام آزاد' رشید احمد صدیقی اور سرسید نے بھی مضامین لکھے۔ ان سب میں انشائی عناصر ملتے ہیں' مگر انہوں نے انشائیہ کا انداز فکر اختیار نہیں کیا۔ انشائیہ' ایک انداز فکر کا نام ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ دوسری اصناف سخن' زندگی کی تیز رفتاری میں بہہ جاتی ہیں مگر انشائیہ اس تیز رفتاری کو بریک لگاتا ہے اور اسے بگٹٹ بھاگنے سے روکتا ہے۔ انشائیہ' زندگی میں ٹھہراؤ پیدا کر کے اسے ٹوٹنے سے بچاتا ہے۔ انشائیہ تخلیق کرنا' ایک صبر آزما کام ہے۔ تخلیق کا یہ عمل' ایک صوفی کا عمل ہے' کیونکہ صوفی' قطرہ میں دجلہ کا نظارہ کرتا ہے۔ تعجب کی بات ہے' کچھ ارباب دانش اسے بور صنف قرار دیتے ہیں' حالانکہ انشائیہ کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔

ہمارے جدید ادب میں جو اصناف مقبول ہوئی ہیں' خاص طور پر افسانہ' آزاد نظم اور انشائیہ' یہ سب باہر سے آئی ہیں' یعنی مغربی ادبیات کے مطالعہ سے ہم ان اصناف کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ انشائیہ کی صنف بھی ہم نے باہر سے لی ہے۔ اور وہاں اس کی تین سو سالوں پر پھیلی ہوئی ایک پوری تاریخ ہے۔ صورت یہ ہے کہ شروع شروع میں مغرب میں انشائیے لکھے گئے' خاص طور پر مانٹین (Montaigne) بیکن (Bacon) اور دوسرے لوگوں نے جو انشائیے لکھے ان کے پیچھے Meditation کا رویہ موجود تھا اور ان کے انشائیوں کا مقصد تھا اونچا اٹھانا یعنی Elevate کرنا اور Philosophise کرنا۔ یہ ایک مقصد تھا جسے لے کر مانٹین اور بیکن آگے بڑھے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انشائیہ یا ایسے (Essay) کچھ عرصہ کے بعد سنجیدہ نگاری میں تبدیل ہو گیا اور "فلسفیانہ" انشائیہ تخلیق ہونے لگا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ سنجیدگی کی فضا میں Essay پوری طرح جذب ہو گیا کہ قارئین کی غالب اکثریت کی اس میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ پھر ایڈیسن اور سٹیل کا دور آیا۔ انہوں نے انشائیے کو مزاح اور طنز کا سہارا دیا۔ اب Essay کا مقصد To Elevate کی بجائے To Pleasee ٹھہرا۔ انشائیے کا مقصد جب Please کرنا قرار پایا' تو مزاحیہ انشائیے اور طنزیہ انشائیے تخلیق ہونے لگے۔ اور معانی دریافت کرنے والا رویہ پس منظر میں چلا گیا۔ پھر انیسویں صدی اور اس کے بعد بیسویں صدی میں یہ دونوں رویے باہم مربوط ہو گئے۔ گویا انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں یہ کہا گیا کہ انشائیہ محض Please ہی نہ کرے' بلکہ قاری کو اوپر بھی اٹھائے۔

چیسٹرٹن (Chestarton)' رابرٹ لینڈ (Robert Land)' ورجینیا وولف (Virginia Woolf) اور پریسٹلے (Priestley) ان سب نے یہ کہا کہ انشائیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کو تصویر کا محض ظاہری رخ نہ دکھائے' بلکہ اس کا چھپا ہوا رخ بھی سامنے لائے۔ مگر اس انداز میں کہ آپ کو کسی قسم کی بوریت محسوس نہ ہو۔

وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ہمارا ادب' خون کی کمی کا شکار ہے۔ ہمارے ہاں فکر کے سانچے تقریباً مستعار ہیں۔ ہم مغربی ادبیات سے یا مشرق کے پرانے لکھنے والوں سے نظریات اخذ کرتے ہیں اور ان کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم بالعموم ان Grooves میں چلتے ہیں' جو پیٹرن کے تحت بنائے جاتے ہیں۔ ان میں شخصی سوچ کا عنصر' ذرا کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ انشائیہ' معمولی چیزوں کے غیر معمولی پہلو کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آپ کی سوچ کو متحرک کرتا ہے۔ جب سوچ متحرک ہوتی ہے تو تخلیق بالخصوص انشائیے میں سوچ کا پہلو ابھر آتا ہے۔ انشائیہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ آپ کی سوچ کو متحرک کرے اور اس کی بہت سی جہتیں (Dimentions) آپ کے سامنے لائے۔

انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے، جس میں انشائیہ نگار، اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور، اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

انشائیہ پر لازم ہے کہ وہ اسلوب یا انشا کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے۔ دوسری شے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے کوئی بت تراش، پتھر کی سل پر سے فاضل بوجھ اتار کر اس کے اندر سے وہ شبیہ برآمد کرے، جو ظاہری

وزیر آغا کلام سناتے ہوئے پرتو روہیلہ نمایاں ہیں۔

آنکھ سے تو پوشیدہ تھی، لیکن جسے بت تراش کی باطنی آنکھ نے گرفت میں لے لیا تھا۔ تیسرے، انشائیہ، ذہن کو بیدار اور متحرک کرے، یعنی شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ تینوں چیزیں یکجا نہ ہوں، انشائیہ وجود میں نہیں آسکتا۔ ہم انشائیہ، اس غیر افسانوی، نثر پارے کو کہیں گے جس میں ایک تو انشائیہ نگار، اسلوب کی تخلیقی تازگی کا مظاہرہ کرے۔ دوسرے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفہوم کو گرفت میں لے اور آخری یہ کہ وہ شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ انشائیہ کے لئے ان تینوں اوصاف کا بیک وقت ہونا ضروری ہے۔

پاکستانی ادیب نے انشائیہ کے ذریعے اپنے وطن پاکستان کو دریافت کیا ہے، بلکہ اس سے ایک جذباتی رشتہ استوار کیا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اردو انشائیہ میں ملکی مظاہر، اشیا، رجحانات، حتیٰ کہ فکری تحریکوں تک سے ایک جذباتی تعلق ابھرا ہے۔ یہ تعلق خاطر دوسری اصناف ادب میں موجود نہیں۔ مثلاً غزل اور نظم میں تجریدیت اور علامتی رویہ غالب ہے۔ افسانے میں اصل زندگی کے متوازی ایک جہان دیگر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اور افسانہ نگار پلاٹ اور کہانی کے آئینے میں اصل زندگی کو دیکھتا ہے۔ مقالات میں اصل زندگی کو معروضی زاویے سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ انشائیہ ہی ہے، جس میں اشیا اور مظاہر کو براہ راست مس کرنا ممکن ہے۔ لیکن اس لمس میں Emotive رویہ، ہمہ وقت کارفرما رہتا ہے۔

زندگی کی کئی سطحیں ہیں، ایک سطح تو وہ ہے، جس سے ہم سب واقف ہیں، یعنی اپنی عام زندگی کی شخصیت، لیکن اس شخصیت کے اندر ایک اور شخصیت بھی ہے۔ انسان کے اندر ایک اور انسان بھی ہے۔ اس داخلی انسان کو تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم انشائیہ کی آبدوز میں بیٹھ کر سائیکی کی گہرائیوں میں اتریں اور سراغ زندگی پانے کی کوشش کریں۔ انشائیہ سے بڑھ کر ہمارا کوئی ساتھی یا غمگسار ثابت نہیں ہو سکتا۔

وزیر آغا کی شاعری روحانی گمشدگی اور تہذیبی بے جہتی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور ہمیں اپنے عہد کے فکری بحران سے عرفان کی بصیرت عطا کرتی ہے صنعتی انقلاب نے انسان کو مشین کا وجود دے دیا ہے اور انسان مشین کے فرائض کی انجام دہی اور لمحے لمحے کی عبادت کے پیچھے بھاگ رہا ہے وہ ہر چیز کو اپنی ضروریات کی انگلیوں سے چھوتا ہے' پرانی چاہتیں' رشتے' محبتیں اور اقدار مر رہی ہیں۔ سب کچھ انڈسٹری بن گیا ہے ہمارے جذبے' سوچیں' امنگیں' معصومیاں اور خواہشیں' ہر چیز انڈسٹری بن گئی ہے اور مشینوں کی اس گڑگڑاہٹ کے درمیان وزیر آغا کی مدھرلے سے آواز اپنے کھوئے ہوئے افق کی تلاش میں اندر ہی اندر

سونے والو! تم مالک کو بھول گئے ہو
تم مالک کو بھول گئے ہو
پھر چمکیلی مل کا سائرن
ایک غلیظ ڈرانے والی تند صدا کے روپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں کے
تنگ اندھیرے باڑے میں کہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلّے کو ہانک کے لے جاتا ہے
پھر انجن کی برہم سیٹی
تیغ سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے

چھوڑے ہوئے سفر کی تلاش

نثار ناسک

'ایک نئی زندگی بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ان کے نزدیک رات ماں کی گود ہے اور دن تپتے ہوئے لوہے کا آہنی پنجہ' یہی آہنی پنجہ ضرورتوں کے پہاڑ جیسے دیو کی طرح ہماری راہ میں کھڑا ہے ہم اسے پھلانگ کر ہی' پرانی روحانی آسودگی کے محل پانیوں تک پہنچ سکتے ہیں سکھ کی ساری ندیاں اسی پہاڑ کی دوسری طرف بہہ رہی ہیں وزیر آغا ان کرچیوں کی تلاش میں ہے جو اپنی روح سے بچھڑ گئی ہیں گئے زمانوں کی اقدار کے کھو جانے کا انہیں بہت دکھ ہے وہ بکھرے ہوئے لمحوں' روشنیوں' چاندنیوں' صبحوں' شاموں اور ہواؤں کی ٹوٹی ہوئی شکلیں جمع کر کے کوئی واضح صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں جگمگاتی ایئر کنڈیشنڈ چھتوں کے سائے کی بہ نسبت برگد کی نیم تاریک چھاؤں تلے زیادہ شانتی ملتی ہے وہ برگد کی اسی چھاؤں کی تلاش میں ہیں جس کی آغوش میں ہم سے پہلے لوگوں نے اپنے وجود کا گیان پایا تھا انہیں ملوں کے دھوئیں سے خوف آتا ہے ڈر لگتا ہے' وہ صبح سویرے پو پھٹے مل کا سائرن سننے کی بجائے کوئی پوتر لہلہاتی ہوئی سریلی آواز سننا چاہتے ہیں۔ جو ان کی روح کو سرسبز کر دے

صبح سویرے
ایک لرزتی کانپتی سی آواز آتی ہے

اور شب بھر کی تھکی ہاری اِک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے ---------
--------- کوہ ندا
کبھی تم جو آؤ
تو میں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں
تمہیں اپنے اس آہنی شہر میں لے چلوں
ایک لوہے کے جھولے میں تم کو بٹھاؤں
تمہیں سب سے اونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
ملوں کے یہ رنگ تھنوں سے بہتا دھواں
تنگ گلیوں سے رستی ہوئی نالیاں
جو ساموں کی صورت
مکانوں کے جسموں سے گاڑھے پسینے کو خارج کریں
کہ ناستی ہو گئی شاہراہیں
ہراساں غصیلی تھکی ٹیکسیاں

پرانے گرانڈیل پیڑوں کے کٹنے کا منظر
شکستہ عمارات کی ہڈیوں پر
مڑی چونچ والے
سیہ فام بل ڈوزروں کے
جھپٹنے کا وحشی سماں ------!
------------ ترغیب

وزیر آغا کی شاعری کا سب سے بڑا سچ ایک ایسی تہذیب کی موت ہے جس میں روحانی اقدار زندہ تھیں --- ایک پوری تہذیب اور اس کی روحانی اقدار کی شکستگی نے وزیر آغا کے شعری کشف میں خاصی حد تک ایک ایسی مجبوری کو جنم دیا ہے جس میں مظاہر قدرت' ہوا پانی' بادل' پہاڑ' زمین' چاند' سورج باہم تصادم پذیر دکھائی دیتے ہیں اس تصادم نے "جبر" جیسی چیز کو پیدا کیا ہے اسی لئے وزیر آغا کی شاعری میں چابک ---- گھوڑے ----- اور ----- سموں کی علامتوں سے بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وزیر آغا اپالو کے چلتے ہوئے رتھ کے آگے جتے ہوئے' اپنے آنسوؤں کی بھیگی ہوئی مالا سے ایک نئی تپیا کر رہے ہیں۔ میں نے وزیر آغا کی شاعری کو پڑھ کر یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی شاعری ایک مسلسل تپیا ہے ایک انتھک تپیا ----- جس نے انھیں SPIRITUAL - REVIVAL کی طرف راغب کیا ہے اور وہ زندگی کو لوہے کے آہنی پنجوں سے چھین کر دوبارہ زمین کی شفقتوں کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔

میں وزیر آغا کے شعری مسائل پر بات کرتے ہوئے بار بار مذہبی MYTHS کا حوالہ اس لئے دیتا ہوں کہ ان کے شعری کشف پر جو پراسرار سی اداسی چھائی ہوئی ہے وہ مابعدا لطبیعاتی سطح پر تھکے ہارے اور مایوس انسانوں کو اپنی طرف پکارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ پکار یا بلاوا ایک ایسی آتما کی طرح ہے جو کائنات کے مظاہر میں سے گزرتے ہوئے انھیں زندگی اور تحرک سے روشناس کراتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مظاہر کائنات زمانی اور مکانی دونوں سطحوں پر زندہ اور متحرک محسوس ہوتے ہیں نہ صرف زندہ اور متحرک محسوس ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ انسانوں کی طرح کائنات کی سٹیج پر اپنے اپنے کردار ادا کرتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ بڑا شاعر وہی ہے جو بڑا خالق بھی ہو۔ خالق کائنات نے اپنی پہچان اور اپنے وجود کی دلالت کے لئے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ جو عناصر اربعہ کی ساری خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔ دکھ' سکھ' مسرت' غصہ' محبت' نفرت اور دوسرے جذبات سے گزرتے ہیں اور ان کا خالق اس تماشے میں پوری طرح شریک ہو کر اپنے آپ کو اپنے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر اگر بڑا خالق ہو تو اس کے کردار زندہ متحرک اور زندگی کے سیاہ و سفید سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں' شاعر ان کرداروں میں اپنے وجود کو پاتا ہے اور ان کی آنکھوں سے رو کر اور ان کے ہونٹوں سے ہنس کر اپنے دکھ سکھ کو ظاہر کرتا ہے۔

وزیر آغا میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی نظم میں بڑے خالق کی طرح سامنے آتے ہیں ان کے کردار زندگی اور زندگی کے کرب و طرب سے بھرپور ہیں ان کی شکلیں واضح اور ان کے مسائل انسانوں کے مسائل ہیں چاہے وہ جسمانی ہوں چاہے مابعد الطبیعاتی:

یہ دن اک شجر ہے
جو چھلکے کے ملبوس سے اپنے ننگے بدن کو جدا کر کے
تاروں بھری کینچلی کو پرے پھینک کر

کالی اندھی زمیں کی کسی درز سے جھانکتا ہے
------------ (پاترا)

سارا منظر کیف کے اک لمحے میں بے بس
لذّت کی بانہوں میں جکڑا ہمک رہا تھا
------------ (بانجھ)

آنکھ ہنسی
پھر کالی کلوٹی رات ہنسی
پھر رات کا پنچھی
پھڑ پھڑ کرتا میرے اوپر منڈلایا
اور مجھے مست پہاڑ نے یک دم.
آنکھ جھکا کر
بھاری پتھر لڑھکایا
------------ (ادھورا لمحہ)

مگر تو نے یہ بھی تو دیکھا
اِدھر شام کی جوالا ٹھنڈی پڑی اور اُدھر
کہنہ بیساکھیوں کے سہارے اپاہج سی اک بڑھیا
بے دانت کے پوپلے منہ سے سیٹی بجاتی ہوئی سامنے آکے

ٹُرک سی گئی
------- (ڈولتی ساعت)

تیز ہوا لانبے چابک سے
کٹے پھٹے جسموں کو ہر سو ہانک رہی ہے
--------- (انتشار)

خندقیں شام سے منہ کھلے ہوئے بیٹھی ہیں
شب کے منحوس پرندے کے پروں کی آواز
جب ابھرتی ہے تو یہ خوف سے تھراتی ہے
--------- (جنگ کی ایک رات)

اور پھر اک دن ظالم سورج
اپنی خونی آنکھ سے مجھ کو گھور رہا تھا
--------- (سنگِ زرد)

نٹ کھٹ باگی تیز سی خوشبو
ناچ ناچ کر ہاری
پھر جب مست ہوئی
چت لیٹ گئی
-------- (بوجھل خوشبو)

پو پھٹتی ہے
نرم سفید انگلی اُوشا کی
گدگدیاں کرنے لگتی ہے
----------- (لمس)

عجب دکھ بھری رات تھی
تند بادل کے پاؤں تلے
خشک دھرتی کی روندی ہوئی لاش تھی
------------ (رت جگا)

سکوت کے لب سلے ہوئے تھے
تھکی ہوئی رہگزر لپٹ کر
خموش پیڑوں سے سو چکی تھی
------------ (حادثہ)

ان حوالوں میں دن۔ منظر۔ رات۔ ہوا۔ خندقیں۔ سورج۔ خوشبو۔ اوشا۔ بادل۔ دھرتی۔ سکوت۔ راہگزر۔ زندہ اور متحرک کرداروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو ہمارے درمیان ہماری ہی طرح زندگی کے دکھ سکھ سے گزرتے ہیں اور باہم متصادم ہوتے ہیں اور ان کے اعمال و افعال کے نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں۔

وزیر آغا نے شاعر کو لفظوں کے جنگل میں ڈرا ہوا ساحر کہا ہے۔ لیکن میں انہیں صرف "ساحر" کہوں گا جو کسی اسم اعظم کے فارمولے سے یا کسی چھومنتر سے نہیں بلکہ اپنی خلاقانہ صلاحیت سے مظاہر کائنات میں زندگی پھونکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ خالق کا سب سے بڑا کردار زندگی دینا ہے اور وزیر آغا نے زمین پر دکھائی دینے والی ہر چیز کو اپنے شعری کشف سے زندگی اور تحرک عطا کیا ہے اور یہ شاید اس لئے ہے کہ انہوں نے زندگی اور زمین سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ وہ طلوع و غروب کے ہر منظر میں اپنے تاریخی شعور کے حوالے سے اپنے آپ کو زمین کا حصہ ہی پاتے ہیں اور زمین کی کششوں سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں ان کا یہ رشتہ بڑا تخلیقی رشتہ ہے کیوں کہ جب ماں نہیں تھی تو انسان کو زمین ہی زیادہ عزیز تھی۔ شاید اسی لئے دنیا کے پہلے آدمی کو خدا کی طرف سے جو پہلی سب سے بڑی سزا دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اسے اس کے قطعہ زمین سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے آدم کی دی جانیوالی یہ سزا انسان اور زمین کے پہلے عظیم رشتے کا سب سے پہلا ثبوت تھا! وزیر آغا نے ہمیں اس رشتے کی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔

میں نے وزیر آغا کے شعری کشف کو چھوڑے ہوئے سفر کی تلاش کا نام دیا ہے اس سے یہ مغالطہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ میں نے ان پر ماضی پرستی کا الزام لگا دیا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں میرے نزدیک وزیر آغا کو اس حقیقت کا شدید احساس ہے کہ ہمارا سفر اور ہماری تلاش ایک دائرے میں ہے اور ہم روح کی بہجت اور اپنے Origin کی تلاش میں ایک دن پھر اس سفر کو شروع کریں گے جسے ہم نے ہر صدی کے کتبوں پر تحریر کیا ہے۔ چاہے وہ سفر غار کے مقدس اندھیروں میں کیا گیا ہو۔ چاہے فرات کے کنارے تپتی ہوئی ریت پر اور چاہے برگد کی پوتر اور گھنی چھاؤں کے نیچے پالتی مار کر!

ماہِ شکستہ
تابش دہلوی
کا پانچواں شعری مجموعۂ غزلیات
قیمت سوا سو روپے
ادب گاہ 3 اے 6/9 ناظم آباد کراچی 74600

وزیر آغا کے تازہ خطوط

(معاصرین کے نام)

مرتب سلیم آغا قزلباش

جوگندر پال کے نام

14 نومبر 1991ء

برادرم جوگندر پال جی۔ آداب!

شکر ہے کہ اس بار آپ کا وہ خط مل گیا جس میں آپ نے "اک کتھا انوکھی" کے بارے میں اپنے تاثرات بڑے جذب کے عالم میں لکھے ہیں۔ میرے لئے آپ کا یہ خط نظم کی تخلیق مکرر کے برابر ہے۔ آپ نظم کے بڑے اہم نکات اور مقامات پر رکے ہیں۔ اور پھر ایک تخلیقی سوچ میں بہہ گئے ہیں۔ کسی تخلیق کو پڑھ کر اس کے مفہوم کو نشان زد کرنا تو HERMENEUTICS کی محض بالائی سطح تک خود کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ مگر تخلیق کو اس طرح پڑھنا کہ اس کی معنیاتی توسیع ممکن ہو یہ ایک تخلیقی طور پر فعال قاری ہی کے لئے ممکن ہے "کیا سے ہوا ہے؟" کے مقام پر آپ کو رکنا ہی چاہئے تھا۔ نظم کو جب میں نے دوسری تیسری بار پڑھا تو مجھ پر کھلا کہ نظم کے دونوں کردار دراصل ایک ہی کردار ہیں ایک ایسا کردار جو اپنے ہی بھیتر کے دوسرے رخ سے ہم کلام ہے۔ ہر تخلیق کار JANUS-FACED ہے۔ اس کا باہر والا چہرہ کھلی آنکھوں سے خارج کو دیکھتا ہے اور اندر والا چہرہ آنکھیں میچے اندر کے جہان کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مزہ اس وقت آتا ہے جب یہ دونوں چہرے ایک ہو جاتے ہیں اور آنکھیں دو جہانوں کو دیکھنے کے بجائے ایک ہی جہان کو دیکھنے لگتی ہیں۔ غالباً یہی تخلیق کا لمحہ ہے جس میں تفریق اور تقسیم کی ساری صورتیں ایک انوکھی وحدت میں منقلب ہو جاتی ہیں۔ نظم تخلیق کرتے ہوئے مجھے قطعاً کچھ علم نہیں تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ بس اندھیرے میں روشنی کی ایک بے حد باریک سی لکیر ابھری تھی اور میں اس لکیر پر خود کو ارتکاز کی ایک شدید کیفیت میں گم کئے وجد کے عالم میں اسیر سفر کرتا چلا گیا۔ یہ تو نظم لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ میں نے کہاں کہاں کا سفر کیا۔ بلکہ ابھی تک پوری طرح معلوم نہیں ہوا۔ لگتا ہے ہر تخلیق قرات پر باغ کا کوئی چوتھا کھونٹ نظر آئے گا۔ میرا خیال ہے ہر تخلیق اسی طرح راستے وا کرتی ہے چاہے وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔

اس سال کے تیسرے ماہ کے دوران میں نے یہ نظم لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد یوں لگتا ہے جیسے اندر بالکل خشک ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد میں نے اب تک ایک بھی شعر نہیں لکھا۔ شاید میں نے خود کو پوری طرح اس نظم میں انڈیل دیا تھا۔ اب پیالہ آہستہ آہستہ بھرے گا تو چھلکنے کی نوبت آئے گی مگر آپ کے خط نے مجھے تر و تازہ کر دیا ہے۔ بہت بہت شکریہ!

"غزلیں" کے بارے میں ضرور معلومات حاصل کریں۔ سرور تونسوی سے بھی پوچھ لیں کیونکہ پچھلی بار انہوں نے مجھ سے "غزلیں" چھاپنے کی اجازت لے لی تھی۔

اوراق کی کاپیاں جڑ گئی ہیں۔ چند روز میں پریس کے حوالے کر دوں گا۔

دسمبر میں دہلی آنے کی دعوت ہے۔ مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی افراتفری نے دل دکھا دیا ہے۔ سفر کرنے کو بالکل جی نہیں کر رہا۔

والسلام

آپ کا وزیر آغا

فاروق عثمان کے نام

26 اگست 1991ء

محترم فاروق عثمان صاحب سلام مسنون

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ ممنون ہوں کہ آپ نے منٹو کے نسوانی کرداروں کے بارے میں میرے مضمون کو اتنے غور سے پڑھا اور پھر مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی الجھن کا برملا اظہار بھی کر دیا۔ مصنف کو ایسے خطوط کبھی کبھار ہی ملتے ہیں۔ اگر آپ ایسے زیرک قارئین زیادہ تعداد میں ہوں تو پورے ادب پر بہار آ سکتی

ہے۔

منٹو کے سلسلے میں آپ نے "چونکانے" کی جو بات کی ہے اس سے میں سو فی صد متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک حد تک منٹو کے اس رویے پر او ہنری اور موپساں کے اثرات بھی ہیں تاہم ایک بڑی حد تک یہ منٹو کا اپنا رویہ ہے۔ بلکہ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ ہر اچھا فنکار اشیاء واقعات اور کرداروں کو اس طور مس کرتا ہے کہ وہ "غیر مانوس" ہو جاتے ہیں اور یوں اپنے انوکھے پن کے باعث قاری کو تعجب اور تجسس کی زد پر لے آتے ہیں۔ روسی فارملزم والوں نے اسے DEFAMILIARIZE کرنا کہا ہے۔ مثلاً یہ کہ زندگی میں وافر مقدار میں کہانیاں بکھری پڑی ہیں جو "ادب" نہیں ہیں مگر جب افسانہ نگار ان کہانیوں کو "پلاٹ" کی صورت دیتا ہے تو گویا اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے انہیں DEFAMILIARIZE کرتا ہے اور قاری کی دلچسپی کا باعث بھی یہی ہے۔ سو بات صرف منٹو تک محدود نہیں۔ کوئی بھی ادیب "انوکھے" کی تلاش میں نہیں ہوتا بلکہ "انوکھا بنانے" کے فن سے آشنا ہو کر آگے کو بڑھتا ہے۔ اس لطیف نکتے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

منٹو نے انوکھا بنانے کے عمل کو عورت کے کردار کے علاوہ دیگر کرداروں اور کہانیوں کے معاملے میں بھی برتا ہے اور یہی اچھی بات ہے۔ منٹو چونکا دینے والی عورتوں یا SITUATIONS سے کہیں زیادہ اپنے کرداروں اور پلاٹس کو چونکا دینے کا وصف عطا کرنے کا ماہر ہے۔ اور بحیثیت تخلیق کار یہ اس کا وصف خاص ہے۔

جہاں تک منٹو کے نسوانی کرداروں کا تعلق ہے تو میرا موقف یہ تھا کہ بظاہر وہ ایک ایسی عورت کو پسند کرتا ہے جو معاشرتی جکڑبندیوں کو ٹوک پا سے ٹھکرانے پر مائل ہے۔ مگر بباطن وہ عورت کے اس پروٹوٹائپ کے تابع ہے جو ہزاروں برس سے اس برصغیر کے معاشرے میں ایک مثالی اور فطری "عورت" کے روپ میں رائج رہا ہے۔ میرا نکتہ یہ تھا کہ خود منٹو کے افسانے نے اس کے شعوری رویے کو DECONSTRUCT کیا ہے یعنی ہر چند کہ منٹو ایک ایسی نئی قسم کی عورت کو پیش کرنے کی دھن میں تھا جو صدیوں پرانی "عورت" سے مختلف ہو مگر جب اس نے افسانے لکھے تو اس "نئی قسم کی عورت" کے اندر سے وہی پرانی گھر گرہستی پتی پوجا اور ماستا والی عورت برآمد ہو گئی ایک باغی عورت کے اندر سے پروٹوٹائپ کو برآمد کر کے بھی منٹو نے "چونکایا" ہے۔ یہی اس کا فن ہے۔ تاہم یہ غیر شعوری سطح پر ہوا ہے۔ منٹو کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ منٹو کے مقابلے میں اس کے کردار زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے ہیں۔ میرا یہ مضمون ایک حد تک DECONSTRUCTIVE CRITICISM کا بھی نمونہ ہے جو شاید پہلی بار اردو افسانے کے سلسلے میں آزمایا گیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں منٹو کے متشدد کرداروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر در اصل ثابت یہ کیا ہے کہ جن افسانوں میں یہ کردار ابھرے ہیں ان میں بھی مرکزی نسوانی کردار پروٹوٹائپ ہی کے مطابق ہے۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت وغیرہ توقع ہے کہ میری یہ وضاحت آپ کو مطمئن کر سکے گی۔

والسلام

مخلص وزیر آغا

سلطان جمیل نسیم کے نام

10 اکتوبر 1991ء

محترم سلطان جمیل نسیم صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ سب سے پہلے میں اس خط کے آخری جملے کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ چونکہ اس بار اوراق کو اپیل نمبر نہیں ملا تھا اس لئے کراچی کے احباب میں سے بیشتر کے پرچے راغب شکیب کو تقسیم کے لئے بھجوا دیئے گئے تھے بس اسی اتھل پتھل میں کوئی گھپلا ہو گیا۔ آج میں آپ کا ایڈریس دفتر اوراق کو بھجوا رہا ہوں تاکہ آئندہ آپ کو پرچہ براہ راست بھیجا جایا کرے۔

آپ نے تجرید کے بارے سوال اٹھایا ہے کہ اس کی ضرورت فن کے معاملے میں بالعموم اور کہانی کے معاملے میں بالخصوص کیوں پڑی؟ اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصلاً تجریدیت موسیقی سے متعلق رہی ہے مگر اسے مصوری اور شاعری نے بھی برتا ہے اسے تکنیکی اعتبار سے NON-OBJECTIVE یا NON-REPRESENTATIONAL بھی کہا گیا ہے یعنی ایک ایسی صورت جس میں شبہ یا تصویر یا شے کی مدد سے احساس یا خیال کو REPRESENT نہیں کیا جاتا بلکہ آواز کے پیٹرن یہ کام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ جب تجریدی نظم کی بات کی گئی تو اس کے علم برداروں کا موقف یہ تھا کہ شاعری آواز کے زیر و بم اور تار و پود میں ابھرے نہ کہ تشبیہ، استعارہ یا علامتی انداز میں۔ اسی طرح مصوری میں تجریدیت سے مراد یہ تھی کہ اشیا یا صورتوں کی جگہ پیٹرن لے لیں۔ موسیقی تو ویسے ہی صوت پر استوار ہونے کے باعث بے چہرہ ہوتی ہے لہٰذا سب سے زیادہ NON-REPRESENTATIONAL ہے۔ ان تینوں کی تقلید میں افسانے کو بھی تجریدیت سے مملو کرنے کی کوشش ہوئی مگر چونکہ افسانہ بنیادی طور پر REPRESENTATIONAL ہے اس لئے جب کردار، واقعات

اور SITUATIONS منہا ہو گئیں تو یہ محض ایک بے چہرہ احساس بن کر رہ گیا۔ لہٰذا افسانے کے معاملے میں تجریدیت کا تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ کہانی اور کرداروں کے اندر تجریدیت کا جو بعد کہیں کہیں ابھرا اس نے افسانے کو گہرائی تفویض کر دی۔ لہٰذا تجریدیت کے عنصر کے حق میں یا کہانی میں اس کی آمیزش کے حق میں تو بات ہو سکتی ہے مگر افسانے کو تجریدیت کی بنیاد پر پیش کرنے کی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں افسانہ افسانہ نہیں رہے گا۔ ویسے تجریدیت کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ بلکہ آج جب کوانٹم طبیعات نے ذرے ATOM کو ایک تجریدی پیٹرن کا حامل قرار دیا ہے تو خود کائنات کی MYSTERY بھی تجریدیت میں ملفوف نظر آنے لگی ہے۔

دراصل اس پراسراریت کے اندر جانے کے کئی مراحل ہیں۔ ایک مرحلہ تو بت پرستی کا ہے جس میں صورتیں اور شبیہیں وسیلہ بنتی ہیں۔ دوسرا مرحلہ علامت کا ہے جہاں صورتوں اور شبیہوں کے ساتھ معانی کی پرچھائیں ابھر آتی ہیں اور تیسرا مرحلہ تجریدیت کا ہے جہاں فن کار CONCRETE REALITY سے پوری طرح منقطع ہو کر پیٹرن تک رسائی پاتا ہے۔ فن میں تجریدیت اس کا CORE ہے۔ اس کا MOLTEN LAVA یا پگھلی ہوئی بے صورت "صورت" ہے۔ فن اس CORE یا جوہر تک پہنچنے کی سعی میں ہمیشہ رہا ہے۔ مگر اس کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ زیادہ تر بت یا صورت کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا تصوف نے کائنات کی تجریدیت کا احساس دلایا ہے اور موسیقی تجرید کی سطح پر اس کا احساس دلاتی ہے۔ شاعری مصوری اور افسانے نے بھی اس سطح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں شاعری کو ایک حد تک کامیابی ہوئی، مصوری کو اس سے کم مگر افسانے کو (میری ناچیز رائے میں) کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ والسلام

مخلص وزیر آغا

شہناز شہر کے نام

19 اکتوبر 1992ء

برادرم شہناز شہر صاحب آداب!

آپکا خط مل گیا تھا مگر میں اوراق کے سلسلے میں مصروف تھا اس لئے فوری طور پر جواب تحریر نہ کر سکا۔ اب پرچہ پریس کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ نومبر میں شائع ہو جائے گا۔

سرسید سیمنار جو اکتوبر میں ہونا تھا، ملتوی ہو گیا ہے۔ اب یہ دسمبر میں ہو گا۔ تب آپ سے ملاقات ہو گی۔ انشاء اللہ!

آپ نے اپنے خط میں میرے مضمون "غالب اور تصوف کی روایت" کے سلسلے میں جو استفسارات کئے ہیں وہ اس بات پر دال ہیں کہ آپ نے مضمون کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ یہ استفسارات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ محض ایک خط میں ان کا جواب ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے تو مزید ایک مضمون درکار ہو گا۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے مضمون نے آپ کے لئے سوچ کی غذا مہیا کر دی۔

آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اوتار سنگھ دگل صاحب کا خط بھی بھجوا دیا۔ انہوں نے بڑی خوبصورت باتیں لکھی ہیں میرا موقف یہ تھا کہ یہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ کوئی اصلی صوفی ہے یا نقلی یعنی کیا اس کے عرفان میں تجربے کی خوشبو شامل ہے یا اس کا علم محض اکتسابی ہے۔ ہاں اگر وہ فن کار ہے تو اس کا فن اس بات کی گواہی دے گا کہ اس کا تجربہ صادق ہے یا نہیں! یہ کہنا کہ صوفی اپنی موجودگی سے نیز اپنی گفتار، کردار اور شخصیت سے اپنے صوفی ہونے کا ثبوت پہنچاتا ہے، اس لئے یونیورسل حقیقت نہیں ہے کہ بے شمار صوفی ان سب اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود تجربے سے ناآشنا ہوتے ہیں گویا ان کی PERFORMENCE ناظر کو دھوکا دے سکتی ہے مگر فن اپنے ناظر کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ فن میں فنکار ننگا ہو جاتا ہے۔ محترم اوتار سنگھ دگل صاحب نے اپنے خط کے آخر میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر میں سچے صوفی سے ملنا چاہتا ہوں تو انہیں ملوں تو اس بات سے مجھے تشویش ہوئی کیونکہ "ایک" صوفی کے ہاں تو "میں" معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ تو ایک ایسا محیط و بسیط کل بن چکا ہوتا ہے کہ جس کا ایغو EGO موجود ہی نہیں ہوتا۔ ایغو اس کیفیت کی ضد ہے جسے احساس بحر آسا کہا گیا ہے۔

میں صوفی اور شاعر کا موازنہ نہیں کر رہا۔ کرنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ دونوں کے میدان جدا جدا ہیں۔ صوفی معرفت حاصل کرتا ہے جب کہ شاعر تخلیق کرتا ہے۔ صوفی "موجود" کو عبور کرتا ہے جب کہ شاعر موجود کی قلب ماہیئت کرتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بے مثال ہیں اور حقیقت اولیٰ کے روپ ہی کے آئینہ دار۔ صوفی اس کیفیت کا قتیل ہے جسے BEING کہا گیا ہے جب کہ شاعر حقیقت اولیٰ کے اس روپ کا جسے BECOMING کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں تصوف کی روایت نے بالعموم BECOMING کو سراب یا مایا کہہ کر مسترد کیا ہے جب کہ شاعر نے اس کی مدد سے خالق کائنات کے تخلیقی عمل کے متوازی ایک اپنے تخلیقی عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح تصوف کے سارے مکاتب نے خواہش کی نفی کی ہے جو BECOMING میں فعال ہوتی ہے جب کہ شاعر کے ہاں خواہش ہی سب کچھ ہے۔ صوفی اور شاعر فن کار TRANSCENDENCE کے مقام پر پہنچتے ہیں ---- اس فرق کے ساتھ کہ صوفی موجود کی تکذیب سے اور شاعر موجود کی قلب ماہیئت سے اس مقام تک پہنچتا ہے۔

میں نے لکھا کہ جب غالب نے ہونے کے عالم' موجد کی کار فرمائی اور خواہش کی کار کردگی کے حق میں آواز بلند کی تو گویا صوفیانہ مسلک کے متوازی ایک اپنا فکری نظام کھڑا کیا۔ موجود کے لمحے پر کھڑے ہو کر اور حسن کو اس کے مادی پہلوؤں سمیت پوری شخصیت کے ساتھ محسوس کرنے کا یہ عمل جو غالب کے ہاں موجود ہے' بعد کے شعرا کے ہاں بھی نظر آسکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال "مجید امجد" کی شاعری ہے "جواب" کے لمحے کا اثبات کرتی ہے جدید اردو نظم اور غزل میں بھی کائنات کو حقیقی سمجھنے کا رویہ اور موجود کو اس کے سارے پرتوں اور نقابوں سمیت دیکھنے کا عمل ملاحظہ کیا جا سکتا ہے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ شاعری کا اصل رویہ ہی موجود کو قبول کرنے کا ہے نہ کہ اسے مسترد کرنے کا۔ غالب سے قبل بھی یہ رویہ موجود تھا مگر اس پر روایتی صوفیانہ تصورات کی تہ جمی ہوئی تھی یا اس پر لذت کوشی کا رجحان غالب تھا۔ غالب نے شے کے اندر اس کی موجودگی کو دریافت کیا' اسے محسوس کیا' اس کا اعلان کیا اور اس پر قدم رکھ کر پوری کائنات میں پھیل گیا۔ جدید اردو شاعری کو اگر غور سے پڑھیں تو غالب کا یہ انداز نظر ہمیں جا بجا نظر آئے گا۔ اسی لئے روز بروز غالب اس قدر مقبول ہو رہا ہے

معلوم نہیں میں اپنے موقف کو واضح بھی کر سکا یا نہیں۔ بہرحال ملاقات ہوگی تو اس پر مزید باتیں ہو سکیں گی۔ والسلام مخلص وزیر آغا

شافع قدوائی کے نام

28 اکتوبر 1992ء

برادرم شافع قدوائی صاحب۔ السلام علیکم!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کی نظر ادب بالخصوص تنقید کی تازہ کروٹوں پر رہتی ہے اور آپ ایک نہایت دیانت دار نقاد کی حیثیت میں سچ کو جھوٹ سے ممیز کرنے پر قادر ہیں۔ آج کے زمانے میں جب منافقت کا رواج عام ہو رہا ہے اور گروپ بازی نے تحسین و تنقید کے معروضی انداز کو نقصان پہنچایا ہے مجھے آپ کا رویہ نہایت صحت مند نظر آتا ہے۔ فاروقی کے سلسلے میں آپ کی دونوں باتوں سے میں متفق ہوں۔ شعر کی مدد سے شعریات مرتب کرنے کی کاوش یقیناً دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے البتہ اگر کسی قدیم تذکرہ میں شعریات کے بارے میں کوئی اوریجنل بات موجود ہے تو اسے سامنے لانا چاہئے۔ اس سلسلے میں بھی رعایتی نمبر دینے کا رویہ عام ہے۔ مغرب میں جب کوئی نئی تھیوری' نئی ایجاد آتی ہے تو قدامت پرست فوراً قدیم کتب اور مخطوطات میں اسے دریافت کر لیتے ہیں۔ مزہ تو جب ہے کہ وہ قدیم کتب سے کوئی نئی تھیوری کشید کر کے دکھائیں۔ ایک ایسی تھیوری جو مغرب کے لئے بھی نئی ہو فاروقی صاحب ہو یا کوئی اور' مغربی فکر پر مشرقی فکر کی فوقیت کو اس انداز میں پیش کرنے کا رویہ ہی غلط ہے۔ البتہ مشرقی فکر کے وہ پہلو جو مبسوط انداز میں سامنے آچکے ہیں مثلاً بدھ مت جین مت' ویدانت' قادمت' اسلامی تصوف وغیرہ۔ تو یہ سب موازنہ کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں مثلاً کیپرا وغیرہ نے بڑی کامیابی سے ایسا کیا بھی ہے ------ فاروقی صاحب نے لوگو سینٹر ازم کو مسترد کرنے کا سہرا کولرج کے سر باندھا ہے اور وہ بھی اسی کے خطوط اور ٹیبل ٹاک کے حوالے سے ------ یہ بھی قدیم مخطوطات میں "لوہے" کی لفظ پڑھ کر ہوائی جہاز کی ایجاد کا سہرا ان قدیم مخطوطات کے سر باندھنے والی بات ہے۔ لوگو سینٹر ازم کے تصور کو کولرج سے ہزاروں برس پہلے مشرقی تصوف نے توڑ دیا تھا مگر اس کا انداز منفی نہیں تھا۔ مشرقی تصوف نے دراصل لوگو سنٹر ازم کا ایک نیا پرت پیش کر دیا تھا جس سے سابقہ تصور میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو گئی تھی میں نے ساختیات میں کوڈ اور کو شرسے عبارت ساخت کی تلاش کے عمل کو صوفیانہ مسلک کے بہت قریب پایا ہے اور میں نے اپنے مضامین میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ------ حد یہ کہ ساخت شکنی کے عمل میں بھی تجلک کا تصور حقیقت عظمیٰ ہی کے اوصاف میں سے ایک ہے۔

آپ پہلے نقاد ہیں جس نے میرے مضمون "رولاں بارت" کو اتنی گہری نظر سے دیکھا ہے اور پھر کہا ہے کہ اس انداز میں پہلے کبھی رولاں بارت پر لکھا نہیں گیا۔ یہی میں خود محسوس کر رہا تھا مگر میرے لئے اپنی تعریف میں ایسا کوئی جملہ زبان پر لانا بہت مشکل تھا۔ بہرحال اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اوریجنل مضمون ہے تو کیا مناسب نہیں کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مغرب کے کسی میگزین میں چھپوایا جائے۔ اس بات پر غور کریں اور پھر مجھے بتائیں کہ کون ترجمہ کرے گا۔

کیا آپ نے میری کتاب "تخلیقی عمل" کا مطالعہ کیا ہے؟ یہ کتاب میں نے 1970ء میں لکھی تھی جب مغرب میں ابھی پس ساختیات کی مباحث کی ابتدا تھی مگر اس کتاب میں ایسے CONCEPTS آگئے ہیں جن کا مطالعہ جدید مغربی تنقید کی پیش رفت کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اس میں مزاج CHAOS کا تصور جس میں سے تخلیق ایک جست لگا کر برآمد ہوئی ہے یعنی DISCONTINUTY کا عالم! وغیرہ ازراہ کرم اس کتاب پر ایک نظر ڈال کر مجھے بتائیں کہ کیا اس کتاب میں واقعی ایسے CONSEPTS ابھرے ہیں۔ اوراق اب پریس میں ہے۔ نومبر میں شائع ہو جائے گا۔ آپ کی فرستادہ کتاب نے بہت مزہ دیا۔ آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہاں سے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھے لکھیں۔

معاصر اردو تنقید پر آپ کا مقالہ دسمبر کے آخر تک مجھے ضرور مل جانا چاہئے والسلام

مخلص وزیر آغا

○

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کارواں مشتِ پر میں تھا

○

جانے کہاں کہ رات کی بانہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

○

رنگ اور روپ سے جو بالا ہے
کس قیامت کے نقش والا ہے

○

پتی پتی ہوئے ہیں پھول تمام
پھر بھی خاموش پھول والا ہے

○

جبینِ سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا
میں رہگزر تھا مجھے روند کر زمانہ گیا

○

میں ایک ڈولتا ساگر مجھے اٹھاتا کون
ہوا اٹھا کے چلی تھی مگر چلا نہ گیا

○

ورق ورق نہ سہی عمر رائیگاں میری
ہوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا

○

اپنی عریانی چھپانے کے لئے
تو نے سارے شہر کو ننگا کیا

○

دھنک دیوار ہے رستے میں حائل
وگرنہ جست بھر کا فاصلہ ہے

○

اسے بند آنکھ سے میں دیکھ تو لوں
مگر پھر عمر بھر کا رت جگا ہے

○

دل کہ ہے راستے کا اک پتھر
آؤ اس کوہِ غم کو پار کریں

○

لازم کہاں کہ سارا جہاں خوش لباس ہو
میلا بدن پہن کے نہ اتنا اداس ہو

○

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

○

اس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پروبال اس کے

○

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ، زمیں بے لباس تھی

○

اک بار ہم نے پار کیا چپ کا ریگزار
پھر عمر بھی اٹے رہے لفظوں کی دھول میں

○

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

○

تیز چابک ہیں دونوں، دن اور رات
مل رہی ہیں ہمیں سزائیں سُن

○

آہٹیں، دھڑکنیں، دبی آہیں
جاگ اٹھی ہیں پھر بلائیں، سن

○

سیلِ غم تو نے سہہ لیا چپ چاپ
اب تو ٹوٹے ہوئے کنارے، بول

○

تیز تلوار ایسا سناٹا
اور سہمے ہوئے ہمارے، بول

○

چپ رہوں اور اسے ملال نہ ہو
ان کہی کا تو ایسا حال نہ ہو

○

اتنے چپ چاپ کبھی رات کے تارے بھی نہ تھے
اور یوں مہر بہ لب زخم ہمارے بھی نہ تھے

○

نافۂ لفظ کی خوشبو کا بکھرنا، دیکھیں
اپنی آواز سنیں اس کا سمٹنا دیکھیں

○

جال پھینکیں کبھی اس کالی گھٹا میں ہم بھی
اور پھر جال میں بجلی کا تڑپنا، دیکھیں

○

لفظ مفہوم سے ڈرتا ہے سدا
حرفِ بے خوف و خطر جاگتا ہے

آگیا وہ تو یہ جانا ہم نے
کیسے دیوار میں در جاگتا ہے

○

سیاہ بادل میں برق کوندی تو سب نے دیکھا
تری ہنسی نے مجھے رلایا تو میں نے جانا

○

ہوا میں شامل تھی تشنگی اس کے تن بدن کی
ہوا نے میرا بدن جلایا تو میں نے جانا

○

دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا
اب کہاں آئے گا وہ لوٹ کے آنے والا

○

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا

○

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

○

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

○

اک رات کبھی اپنے بدن میں بھی گزاروں
صحرائے بدن اتنا تو سنسان نہیں ہے

○

میں دبے پاؤں ترے سوئے ہوئے آنگن سے
صبح کی پہلی کرن بن کے گزرنا چاہوں

○

آہستہ بات کر کہ ہوا تیز ہے بہت
ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

کھلی جو آنکھ تو دشتِ خیال تھا ہرسو
پھر اس کے بعد سفر سارا خواب ایسا تھا

○

اس بے وفا سے قطع تعلق کی دیر تھی
جینا بھی اور مرنا بھی آسان ہو گیا

○

سرشت اسکی قصیدہ، غزل مزاج مرا
قریب لا کے بھی ہم کو جدا جدا رکھنا

○

کچھ دیر تک میں خود ہی رہا اپنا ہم سفر
پھر اس کے بعد راستہ سنسان ہو گیا

○

سوچا یہ تھا کہ ہم بھی بنائیں گے اس کا نقش
دیکھا اسے تو نقش بہ دیوار ہو گئے

○

میرے دکھی سوال کا اس شام تیرے پاس
بھیگی ہوئی نظر کے سوا کیا جواب تھا

○

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اتار کر

○

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سونا پڑا ہے

○

وزیر آغا ہمراہ غلام جیلانی اصغر۔

انشائیہ

آندھی
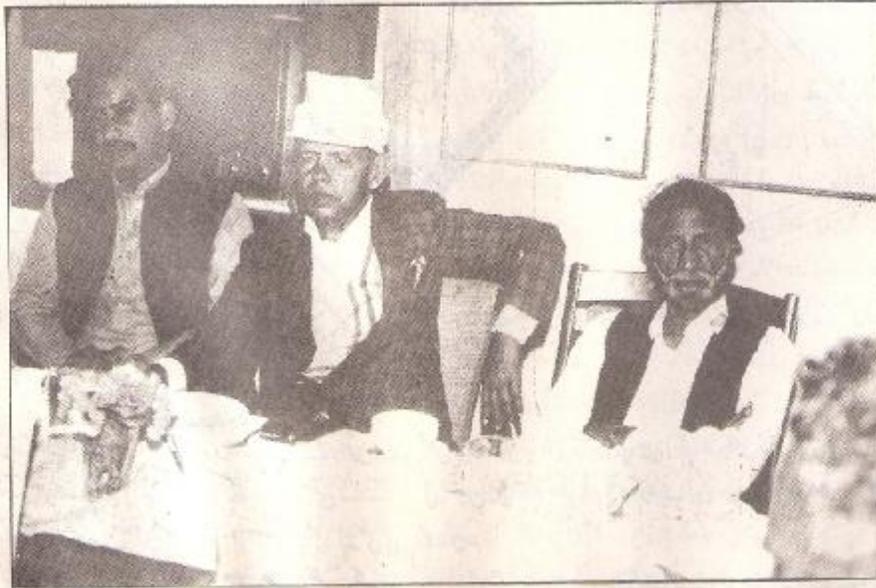
وزیر آغا

ہمارے ملک کے اکثر شرفا آندھی کو ایک لعنت سمجھتے ہیں اور اس کی شان میں بعض اوقات غیر شریفانہ اور نازیبا کلمات کے استعمال میں بھی کوئی قباحت نہیں دیکھتے۔ چاہے آپ چند لفظوں کے لئے میری شرافت کو شبہ کی نظروں سے ہی کیوں نہ دیکھنے لگیں۔ میں ان شرفا کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور علی الاعلان اس بات کا اظہار کرتا ہوں (اور قاعدے کے مطابق اس اظہار میں مسرت محسوس کرتا ہوں) کہ میں آندھی کا سب سے بڑا مداح اور اس کے طریق کار کا سب سے بڑا علمبردار ہوں۔

جس طرح موسم کی پیش گوئی کرنے والے، سیاسی یا اخلاقی مسلک کے اہل فکر سے مخاطب ہوں۔ کہ میری دانست میں یہ طبقہ نسبتاً زیادہ خطرناک ہے۔ اور پہلے اس طبقہ کے غلط رجحانات کا سدباب ہونا ضروری ہے۔

بظاہر آندھی، پچاس ساٹھ یا ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوئی اس ہوا کا نام ہے جو ایک غول بیاباں کی طرح، دھول میں اٹی، اپنے بال کھولے، سیٹیاں بجاتی ہوئی آتی ہے۔ اور سوئی ہوئی زندگی کو جھنجوڑ کر بیدار کرتی اور اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کے مناظر چھوڑتی، آگے کو نکل جاتی ہے۔ لیکن آندھی کی برکتیں تعداد میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے اس کی یہ ننھی ننھی بدعنوانیاں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حیرت ہے کہ اہل فکر نے آج تک آندھی کو
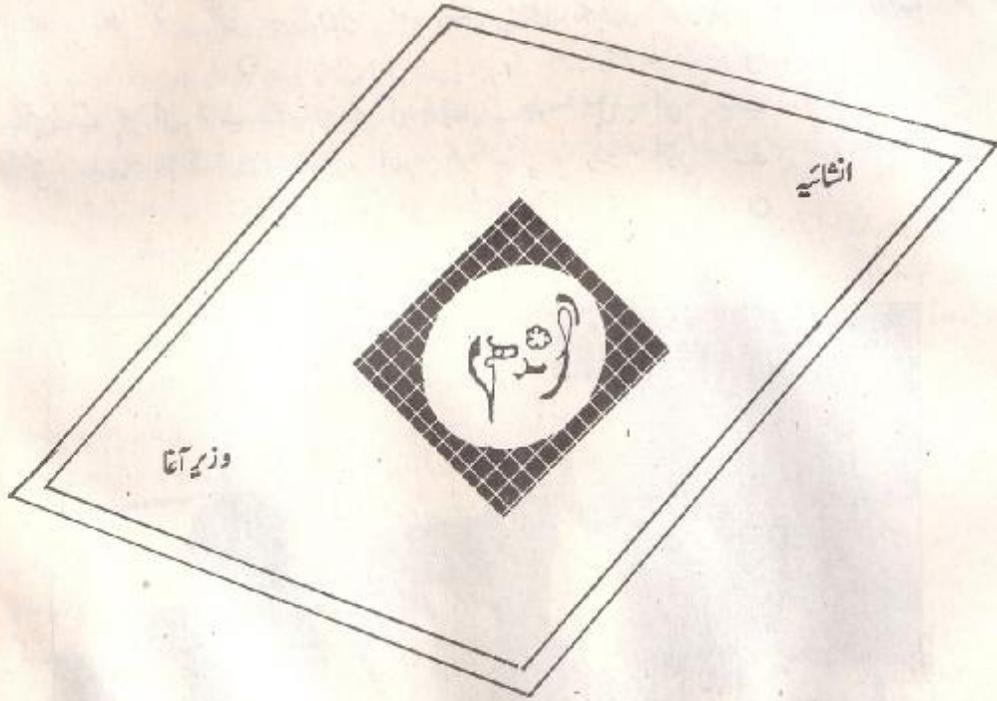
تحت شہر کے باسیوں کے لئے ایک قسم کا موسم اور دیہات میں رہنے والوں کے لئے ایک بالکل مختلف قسم کے موسم کی پیش گوئی کر کے دنیا اور عقبیٰ ------ دونوں میں سرخروئی حاصل کر لیتے ہیں، اسی طرح میرا یہ ارادہ ہے کہ آندھی کی برکات کے سلسلے میں "غیر مہذب" دیہاتیوں کے لئے ایک علیحدہ مضمون لکھوں اور "اہل فکر" کے لئے ایک علیحدہ قسم کی بحث چھیڑوں، تاکہ آگے چل کر جب مجھے قوم کا لیڈر بننے کی ضرورت لاحق ہو تو میں زندگی کے ہر شعبے سے اپنے پیروکار حاصل کر سکوں۔ چنانچہ آج میں آندھی کی برکات کے سلسلے میں صرف

محض ایک غول بیاباں کے روپ میں دیکھا اور اس کی ان برکات سے چشم پوشی کی جنہیں میں آج منظر عام پر لا کر ایک زبردست انسانی خدمت سرانجام دینے لگا ہوں۔

آندھی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ جہاں یہ آپ کے دیکھنے، سننے، بولنے اور سونگھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرتی ہے، اور یوں ان بہت سی شمعوں کو بجھا کر آپ کی حسیات پر ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلط کر دیتی ہے۔ وہاں یہ آپ کے سینے کی تاریکیوں میں ایک ننھی سی قندیل بھی روشن کر دیتی ہے۔ جب

سارا عالم ہوا کے وحشی جھونکوں کی زد میں آجاتا ہے۔ اور تاریکی اس قدر گہری ہو جاتی ہے کہ بقول شخصے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ نیز جب آپ یکایک اپنے ماحول سے اس طور کٹ جاتے ہیں کہ آپ کے اور قریب ہی بیٹھے ہوئے آپ کے مہمان کے درمیان گویا میلوں چوڑی خلیج حائل ہو جاتی ہے تو آپ یکایک کچھوے کی تقلید میں اپنے اندر سمٹ جانے میں ہی عافیت دیکھتے ہیں۔ اور ماحول سے اپنے تمام رشتے منقطع کر کے اور اپنی خودی کو چھوٹی سی گپھا میں احساس و شعور کی ایک ننھی سی شمع روشن کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی آندھی کا سب سے بڑا کمال ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی روشنی پر مبذول کراتی ہے اور آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار ہونے میں مدد دیتی ہے۔ آندھی دراصل ایک "چیلنج" ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ اپنی تمام تر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں ------ بالکل جیسے ایک کمزور پودا ماحول کی چیرہ دستیوں کے پیش نظر قبل از وقت ہی پھول نکال لیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس عمل کو "غواصی" سے تعبیر کریں۔ چاہیں تو اہل معرفت کی زبان میں اسے "وصل" کا نام دیں۔ لیکن یہ نہ بھولیں کہ یہ کرشمہ دراصل آندھی کا ہے بات بھی ٹھیک ہے! آخر یہ جو عرب' ایران' ہندوستان اور چین نے زندگی اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیاں کیں کیا ان کا باعث ان ممالک کے لوگوں کی بعض غیر معمولی صلاحیتیں تھیں؟ ہرگز نہیں! ان کا باعث صرف یہ تھا کہ قدرت ان ممالک کو قرن ہا قرن تک آندھیوں سے نوازتی رہی اور ان کے باسیوں کی ظاہری آنکھوں میں خاک جھونک کر انہیں اپنے "اندر" کی تیرہ و تار دنیا کو منور کرنے پر اکساتی رہی۔ اس طریق کار کے جو شاندار نتائج برآمد ہوئے' آج وہ سلسلہ ہائے فکر کی صورت میں آپ سب کے سامنے ہیں اور کیا آپ ان نتائج سے انکار کر سکتے ہیں؟

آندھی ہمیں گیان دھیان ہی کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ خود میں لچک پیدا کرنے کی طرف بھی مائل کرتی ہے۔ اگر آپ نے آج تک آندھی سے آشنا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو میری بات مانئے اور اگلی بار جب آندھی آئے تو خود پر کسی نہ کسی طرح جبر کر کے اس کے طریق کار کا نظارہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ درخت اور پودے آندھی سے برسرپیکار ہونے کی بجائے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے چلے جاتے ہیں اور آندھی کی لہریں ان کے اوپر سے پھیلتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان میں جو درخت ضد' ہٹ دھرمی یا بزعم خود جواں مردی کا مظاہرہ کرتا ہے اور خود میں مناسب لچک پیدا نہیں کرتا' آندھی اس سے یوں انتقام لیتی ہے کہ اسے جڑ سے اکھیڑ کر پرے پھینک دیتی ہے۔ غور فرمایئے' اس بات میں کیسا خوبصورت سبق پنہاں ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو زمانے کی ہوا کا رخ دیکھ کر ہی چلنا چاہئے اور جس طرف ہوا کا رخ ہو چکے سے اسی طرف کو جھک جانا چاہئے۔ جو ایسا نہیں کرے گا اور ضد' ہٹ دھرمی اور رجعت کا ثبوت دے گا' اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ شخص بہت جلد اپنے انجام کو خود ہی پہنچ جائے گا۔ حیرت ہے کہ اہل فکر نے آج تک آندھی سے یہ سبق حاصل نہیں کیا اور اپنے قدیم مسلک سے انحراف کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ نتیجہ دیکھ لیجئے۔ زمانے نے اہل فکر کو کس طرح جڑ سے اکھیڑ کر پرے پھینک دیا ہے اور آج ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنے ملک کے اہل سیاست پر نظر ڈالئے۔ جنہوں نے آندھی سے سبق حاصل کیا اور ہوا کا رخ دیکھ کر چلے۔ اور اگر ہوا کا رخ ذرا بھی بدلا تو ان لوگوں نے اپنی معروفیات کو بالائے طاق رکھ کر سب سے پہلے اپنا رخ تبدیل کر دیا۔ آج عزت اور ثروت ان کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ آج زمانہ ان کے قدموں کا غبار ہے۔ آج ان میں سے ہر شخص آندھی کو راستہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آندھی کا ایک آخری وصف یہ ہے کہ اس کے ذریعے فطرت وہ خدمت انجام دیتی ہے جو بعض اوقات شہر کی چار دیواری میں میونسپلٹی کے کارکنوں کو سر انجام دینا پڑتی ہے میری مراد صفائی سے ہے۔ مگر فطرت کے پیش نظر زمین کی وسیع مملکت ہی ایک شہر ہے اور اس کی میونسپلٹی کے کارکنوں میں آندھی کو ایک مقام امتیاز حاصل ہے۔ دراصل آندھی فطرت کی جاروب کش ہے اور اس کا کام تیزی اور پھرتی سے کوہ و صحرا' شہر و دیہات اور باغ و راغ کو ہر طرح کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کرنا ہے۔ ہمارے شہروں کے میونسپل کمشنروں کو آندھی کے طریق کار سے سبق لینا چاہئے کہ یہ محض خاص خاص سڑکوں تک ہی اپنی مساعی کو محدود نہیں رکھتی بلکہ کونوں کھدروں تک پہنچتی ہے۔ اور ہر شے کو جھاڑ پونچھ کر تازہ دم کر دیتی ہے۔ شاخوں سے زرد پتے گر جاتے ہیں۔ بیکار اور کمزور ٹہنیوں کی کانٹ چھانٹ ہو جاتی ہے' کمزور اور ناتواں مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ اور بجلی کے ناقص کھمبے سربسجود ہونے لگتے ہیں۔ آندھی کی برکتیں ان گنت ہیں۔ آندھی کے تھپیڑے تصنع اور فریب کے سارے پردوں کو چاک کرتے اور ہر شے کی اصلیت کو ننگا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بیک ساران ساحل کو شاید یہ بات پسند نہ آئے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی' اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔

خیال پارے

بارہواں کھلاڑی

کل ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے میرے ایک دوست نے اپنی آنکھوں میں ایک شریر چمک اور ہونٹوں پر ایک مکروہ سی پان زدہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے دفعتاً مجھ سے سوال کیا: "آغا جی! اگر آپ کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت ملے تو کیا آپ اسے قبول کرلیں گے؟"------- میں نے فوری طور پر اس خلیۃ سوال کا جواب دینے کے بجائے پہلے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے ہاتھوں پر ڈالی جن پر وقت اپنی لکیریں چھوڑ کر جا چکا ہے بعینہ جیسے سمندر پیچھے کو ہٹ جائے تو اس کے ریتلے ماتھے پر برہم سی سلوٹیں باقی رہ جاتی ہیں۔ پھر میں نے ایک لمبی سانس لی اور چاہا کہ سانس چند لمحے میرے سینے میں مہمان رہے لیکن اس نے اندر جاتے ہی جانے کس مجبوری کے آثار دیکھ لئے کہ پل بھر بھی نہ رکی اور فوراً نتھنوں کے راستے باہر آگئی۔ تب میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"ایک شرط پر"

"وہ کیا؟" دوست نے حیران ہوکر پوچھا۔

"وہ یہ" میں نے قدرے توقف کیا اور پھر زور دے کر کہا: "وہ یہ کہ مجھے بارھویں کھلاڑی کا منصب جلیل عطا کیا جائے۔ بصورت دیگر میں قومی مفاد کی پروا کئے بغیر ٹیم میں شامل ہونے کی دعوت مسترد کردوں گا۔"

میرا یہ جواب سن کر میرے دوست کی آنکھوں سے شرارت کی رمق اور ہونٹوں سے تبسم کی نمی آن واحد میں رخصت ہوگئی۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو بارھویں کھلاڑی کی حیثیت میں بھی شامل کیا گیا تو ٹیم کو یقینی شکست سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ مگر دوسری طرف میں مطمئن تھا کہ میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس میں ہزاروں انسانی نسلوں کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مگر جس تک میرے دوست کی رسائی قیامت تک بھی ممکن نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس بھلے آدمی کو یہ تک معلوم نہیں کہ ٹیم کے گیارہ کے گیارہ کھلاڑی دراصل "مشقتی" ہیں جو بارھویں کھلاڑی کی تفریح طبع کے لئے میدان میں اترتے ہیں۔ وہ سارا عرصہ میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر نڈھال ہوجاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ دو کوڑی کی اس بدنما گیند کو دوبچ سکیں جسے مخالف ٹیم کے کسی بددماغ بلا باز نے ہوا میں اچھال دیا تھا یا پورا ایک فرلانگ سرپٹ دوڑنے کے بعد گیند کو اس طرح پھینکیں کہ لکڑی کی تین بدوضع تکلیوں میں سے کم از کم ایک اس کی زد میں ضرور آجائے یا بلے کی مدد سے گیند کو خلق خدا کے سروں کے اوپر سے گزارنے کا اہتمام کریں۔ سوچئے کس درجہ مضحکہ خیز حرکات ہیں۔ مگر بارہواں کھلاڑی ایک بڑی حد تک ان جملہ حرکات سے محفوظ اور قعر دنیا کے درمیان "تختہ بند" ہونے کے باوجود ہوشیار رہتا ہے اور اپنا دامن تر نہیں ہونے دیتا وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ بنیاً محض ایک تماشائی ہے۔ وہ کرکٹ کے میدان میں ضرور اترتا ہے مگر اس وقت جب کسی کھلاڑی کو پیراسٹامول کی ایک آدھ گولی پہنچانا درکار ہو یا اسے تیز باؤلنگ سے بچاؤ کی وہ ترکیب بتانا مقصود ہو جو خاندانی نسخوں کی طرح صرف کپتان ہی کو معلوم ہے لیکن جس پر خود کپتان کو اپنی باری میں عمل کرنے کی توفیق نہ ہو سکی تھی یا جب کپتان محسوس کرے کہ اگر بارھواں کھلاڑی میدان میں جاکر دو چار بے معنی دوڑیں نہیں لگائے گا تو اس کی صحت بالکل برباد ہوجائے گی۔ باقی تمام عرصہ یہ "مرد مجاہد" کھلاڑیوں کی گیلری میں براجمان بڑے مزے سے بازیچہ اطفال دیکھتا ہے' مونگ پھلی کھاتا ہے یا اچک اچک کر ٹیلیویژن کیمرے کی زد میں آنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اس کی اصل حیثیت ایک تماشائی ہی کی رہتی ہے اور کسی بھی کھیل میں یہی بنیادی اور مرکزی حیثیت ہے۔

ممکن ہے آپ سوچیں کہ بارھویں کھلاڑی کو تماشائی قرار دینا تماشائیوں کے جم غفیر سے ناانصافی کے مترادف ہے۔ مگر آپ یقین کریں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ تماشائی "تماشائی" ہوتے ہی کب ہیں۔ وہ تو اپنی اپنی ٹیم کے غیر حاضر کھلاڑی ہیں جو میچ کے دوران سارا وقت باؤلروں کے ساتھ باؤلنگ اور بلا

بازوں کے ساتھ پینگ کرتے ہیں اور کبھی کبھار جب طبیعت ذرا مائل ہو تو وکٹ کیپنگ بھی کر لیتے ہیں۔ جب مخالف ٹیم کے بلا باز کی گیند ہوا میں اچھلتی ہے تو اسے دبوچنے کے لئے ہزاروں نادیدہ ہاتھ از خود ہوا میں اٹھ جاتے ہیں اور جب ٹیم کے سب سے ہونہار اور خوبصورت کھلاڑی کے دونوں ہاتھوں میں موجود کسی مستقل سوراخ سے گیند پھسل کر زمین پر آ رہتی ہے تو انھیں یوں لگتا ہے جیسے گیند خود ان کے ہاتھوں سے پھسلی ہے۔ پھر جب کبھی ان کی اپنی ٹیم کا بلا باز چھکا لگاتا ہے تو ان کے ہزار ہا بازوؤں کا زور بلا باز کے بازو میں سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنی ٹیم کی فتح و شکست میں اس درجہ "مبتلا" ہوتے ہیں کہ اگر ٹیم جیتے تو یہ ان کی ذاتی جیت ہے اور اگر ٹیم ہارے تو یہ ان کی ذاتی شکست ہے۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ مجمع حقیقتاً ایک ایسی "ہستی" ہے جس کے ہزاروں سر اور بازو ہیں، جس کی لاتعداد آنکھیں اور ان گنت کان ہیں اور جو بیک زبان اپنی خوشی، غمی یا برہمی کا برملا اظہار کرتی ہے اور کھیل میں بھرپور شرکت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بیچ میدان کھڑی ہے نہ کہ کرچ کرچ ہو کر گراؤنڈ کے چاروں طرف کی نشستوں پر بکھری پڑی ہے۔ یہ "ہستی" بیک وقت اپنی ٹیم کی ہمزاد، ساتھی، منصف اور ضمیر کی آواز ہے۔ لہٰذا جب کوئی کھلاڑی میدان میں کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس ہستی کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے اور جب اس سے کوئی حماقت یا کوتاہی سرزد ہوتی ہے (جو اکثر ہوتی ہے) تو یہ ہزار پایہ ہستی اس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے اور وہ اس کی برہم آنکھ کی تاب نہ لا کر فوراً ہیلمٹ میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ گویا ان دونوں میں "گفتگو" ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ اگر گفتگو کا یہ سلسلہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو میچ قطعاً بے معنی اور بے لطف ہو کر رہ جائے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ گیارہ افراد کی ٹیم اس ہزار پایہ اوکٹوپس (OCTOPUS) سے ایک جذباتی رشتے میں منسلک ہوتی ہے۔ خوشی، غم، غصہ اور ہیجان ــــــ ان سب میں یہ دونوں ایک ساتھ شرکت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی تلافی قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی "تماشائی" نہیں، دونوں مبتلائے عشق ہیں۔

دوسری طرف بارھواں کھلاڑی ایک مرد آزاد ہے۔ اس کی بلا سے اگر ٹیم ہارے یا جیت سے سرفراز ہو۔ اگر ٹیم خدانخواستہ جیت گئی تو اس کے گلے میں کوئی ہار پہنانے نہیں آئے گا اور اگر ٹیم ہار گئی تو اس سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ اسے دیکھ کر "شیم شیم" کے نعرے نہیں لگائے گا اور اس پر مکھڑے کے چھلکے نہیں پھینکے گا۔ یہ شخص ٹیم کی فتح و شکست ہی سے بے نیاز نہیں بلکہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں۔ اسے معلوم ہے کہ کوئی سرپھرا اسے "مین آف دی میچ" کا اعزاز نہیں دے گا اور کوئی اخبار اس کی صحت یا علالت کے بارے میں اپنے قارئین کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ بارھواں کھلاڑی راہ و رسم عاشقی کے ان جملہ نازک مقامات سے قطعاً محفوظ ہے۔ وہ میچ کے پانچوں دن اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا ہے۔ خوش خوراکی کے معاملے میں بھی اسے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ کپتان کی تعریف یا سرزنش سے بھی اسے کوئی سروکار نہیں۔ غرضیکہ بارھواں کھلاڑی، کھلاڑی کہلانے کے باوصف اپنی ٹیم کی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش اور اس کی تمام تر دھڑکنوں سے بے نیاز ہے۔ یہی تماشائی کا اصل منصب بھی ہے کہ وہ تماشہ میں شریک ہونے کے باوجود تماشہ سے الگ بھی رہے۔

بارھویں کھلاڑی کی لوح دل ہر قسم کے نقش اور نام سے بھی محفوظ ہے۔ وہ کمال بے نیازی سے ان خوش وضع کھلاڑیوں کو دیکھتا ہے جو نازک سی بیاضوں پر کلک گوہریں کا جادو جگاتے ہیں اور جن کے خود نوشت دستخطوں پر جھکی ہوئی ان کی مسکراہٹ لحہ بہ لحہ دلکشیں گراتی چلی جاتی ہے۔ بارھواں کھلاڑی کو اپنی آنکھوں کے سامنے شب و روز ہونے والے اس بیہودہ ناٹک سے کوئی سروکار نہیں۔ بعض اوقات تو وہ اس ساری کارگزاری کو بھی میچ ہی کا حصہ سمجھتا ہے اور پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر دوبارہ مونگ پھلی کھانے لگتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بیاض پر دستخط کا حصول تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس کے پیچھے وہی کاروباری رویہ موجود ہے جو میچ دیکھنے کو میچ میکنگ کے لئے ایک زینہ بنانے کا متمنی ہے اور وہی جبلت کارفرما ہے جو بقائے بہترین کے لئے موزوں انتخاب کو ناگزیر قرار دیتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ شکاری خود شکار ہو رہا ہے۔ بے چارہ شکاری!

بارھواں کھلاڑی اصلاً ایک صوفی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیائے رنگ و بو، یہ ہر لحہ صورت بدلتا ہوا جیون، یہ شادیانے، پٹاخے، چیخیں اور قہقہے ــــــ یہ سب کچھ بے معنی ہے! یہ کرکٹ کے میدان میں بنائی جانے والی اور بعد ازاں نامۂ اعمال میں لکھی جانے والی دوڑیں، کیچ اور سنچریاں محض ایک فریب نظر ہے۔ کھیلنے والوں کے علاوہ دیکھنے والوں کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس نہیں کہ پانچ روز پر پھیلی ہوئی مہابھارت کی یہ جنگ ایک بے نتیجہ پیکار ہے۔ اس میں نہ کسی کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ کسی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو فقط سانس رکنے کا وہ لحہ جب آسمان سے اترتی ہوئی سنہری گیند کھلاڑی کے دست بدعا ہاتھوں کی طرف آتی ہے اور پھر جیسے ہوا میں معلق سی ہو کر رہ جاتی ہے اور دیکھنے والوں کے دل چند لمحوں کے لئے دھڑکنا ہی بھول جاتے ہیں مگر بارھواں کھلاڑی کوئی تارک الدنیا نہیں اور نہ اسے رہبانیت کا مبلغ ہی

قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں جو اپنے گھربار کو خدا پر چھوڑ کر کسی درخت کے نیچے دھونی رما کر اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نے دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا کو ترک کر بھی دے تو دنیا اسے ترک نہیں کرتی۔ دنیا کا سب سے بڑا ایجنٹ یعنی جسم' خواہشات کے ہتھیاروں سے لیس اس پر ہر وقت پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ وہ چند دنوں یا مہینوں کے لئے اس پیر تسمہ پا کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ آخر آخر میں اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اس بارھویں کھلاڑی سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لئے ایک سچا صوفی کبھی ترک دنیا کا منصوبہ نہیں بناتا۔ وہ ترک دنیا کے عمل کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اسے احساس شکست پر منتج قرار دیتا ہے۔ سچا صوفی تو بیچ منجدھار ایک لائٹ ہاؤس کی طرح بالکل شانت کھڑا رہتا ہے یعنی ہیم موج سے آشنا تو ہوتا ہے مگر موج کو نوک پا سے ٹھکرانے میں لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ بس یہی اصل بات ہے کہ آپ انبوہ میں رہتے ہوئے بھی اکیلے ہوں۔ مطلب یہ کہ آپ ایک سچے تماشائی کے منصب کو اپنائیں جو تماشے کو زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ ہمیشہ اسے ذرا فاصلے ہی سے دیکھتا ہے۔

بارھواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا ناظر' مفسر' کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلب مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ متسلسل کی طرح سرپٹ دوڑنے کا قائل نہیں بلکہ مرور زمانہ کی طرح مسلسل حرکت کے باوجود ٹھہراؤ کے ایک مستقل عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ میچ کو دیکھتا ہے' اونگھتا ہے اور خوش رہتا ہے۔

میں نے ٹیلی ویژن کی طرف نظریں اٹھائیں جہاں ایک ہی لمحہ پیشتر ہماری ٹیم کے ایک خوش شکل کھلاڑی سے تیسری بار کیچ چھوٹا تھا اور پھر مجمع کی طرف دیکھا جسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا اور تب اپنے دوست پر ایک نظر ڈالی جس کا چہرہ ہلدی ہو گیا تھا۔ میں مسکرایا۔ وہی عارفانہ مسکراہٹ جو صوفی کا واحد اثاثہ ہے اور پھر میں نے چپکے سے بارھویں کھلاڑی کی سفید براق صرف سے دھلی ہوئی وردی پہنی اور بڑے اطمینان سے پلنگ پر دراز ہو کر مونگ پھلی کھانے لگا۔

(دوسرا کنارا)

شام انشائیہ کا ایک منظر

انشائیہ

وزیر آغا

بس اتنی سی بات

کل میں نے کوئی پانچ برس کے بعد آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی اجنبی کوٹ پہنے' ٹائی لگائے' سر کے آخری کناروں سے چپٹی ہوئی سفیدی مائل روئیدگی سے بے پروا' چہرے اور ماتھے کی گہری خندقوں اور آنکھوں کے نیچے ابھرے ہوئے گوشت کے حلقوں میں سے مجھے گھور رہا ہے۔ کچھ وقت تو مجھے اس اجنبی کو پہچاننے میں لگا۔ تب ان آثار قدیمہ کے نیچے سے ایک مانوس چہرے کی مدھم سی جھلک دکھائی دی اور میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "کیا حال ہے"؟ جواب ملا "شکر ذوالجلال ہے!" میں نے کہا "وہ جو ایک شخص خود بخود دل میں سمایا رہتا تھا' اس کا کیا بنا؟" جواب میں اجنبی نے مسکرا کر کہا "دیکھتے نہیں ہو' ڈھل گیا!" ------ "ڈھل گیا!" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کس میں ڈھل گیا؟" اجنبی پھر مسکرایا۔ ایک انتہائی کرب آمیز اور طنزیہ مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ تب وہ بولا "بھائی صاحب! حیران کیوں ہوتے ہو؟ وہ بے چارہ ہزار سانچوں میں سے ایک میں ڈھل گیا۔ ڈھلنا مقدر جو ٹھہرا۔ میرے ہونٹ ایک نہایت اہم سوال کو لفظوں میں منتقل کرنے کے لئے کپکپائے' لیکن اس سے پہلے کہ میرا سوال لفظوں کے سانچے میں ڈھلتا' میری بیوی نے آئینہ میرے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا۔ بولی "بوڑھے ہو گئے' لیکن آئینہ دیکھنا نہ گیا۔ کوئی پوچھے' اب اس میں رکھا ہی کیا ہے! میں تو اسے ہاتھ بھی نہ لگاؤں!"

ہر عورت فطرتاً ایک رابعہ ہے اور اسے مرد سے کہیں پہلے عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ مرد بے چارہ تو چاند کی ایک جھلک پاتے ہی جذبات کے جوار بھاٹے میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ عورت انتہائی جذب کی حالت میں بھی خود آگاہی اور خود شناسی کی بے پایاں دولت سے سرفراز رہتی ہے۔ پھر اسے آنے والے زمانے کے گہرے' لانبے سایوں کا احساس بھی تو نسبتاً جلد ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ میری بیوی کو بھی پہلے ہی چاندی ایسے سفید بال کی آمد پر عرفان حاصل ہو گیا جبکہ میں آہستہ آہستہ ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہو تا گیا جس کے آخر میں ایک گرد آلود آئینہ' ایک اجنبی سا تھکا تھکا چہرہ اور انکشاف کا ایک کرب انگیز لمحہ ایستادہ تھا۔

اور اب میری بیوی کہتی ہے "آئینے میں رکھا ہی کیا ہے؟" لیکن شاید آئینے میں ابھی بہت کچھ رکھا ہے۔ مثلاً اگر میں کل آئینے میں جھانک کر نہ دیکھتا تو مجھے کون بتاتا کہ میں اب پارے کی طرح سیال اور آگ کی طرح فروزاں شے نہیں رہا بلکہ دل کی خنکی اور زمانے کی برفاب ہوا نے مجھے ایک سخت' جامد اور ٹھہری ہوئی شے میں متبدل کر دیا ہے۔ سیال مادے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ذرا سی حرکت بلکہ خفیف سی لرزش بھی اسے بدل کر رکھ دیتی ہے۔ کوئی کنارا' کوئی دیوار' کوئی ضابطہ اس کے راستے میں بند نہیں باندھ سکتا۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ دریا کے پانی کو کناروں نے جو روک رکھا ہے' یہ کیا بات ہے؟ جواب یہ ہے کہ پہاڑوں پر برکھا کی ذرا سی رحمت نازل کر دو اور میدان میں کناروں کے ٹوٹنے کا عمل مفت میں دیکھ لو۔ پھر اگر اس بات کی فلسفیانہ توجیہہ مطلوب ہو تو یونانی مفکرین سے رجوع کرو جو دریا کو جامد مانتے ہی نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے' ایک لمحے میں تم نے جس دریا کو دیکھا' وہ اب کہاں ہے؟ پل کے نیچے پانی کی صورت ہر لحظہ تبدیل ہو رہی ہے۔ پانی تو وقت کی طرح ہے' ہر دم رواں' ہر دم رواں! پانی رکے تو برف کی ایک قاش بن جائے اور وقت رکے تو چہرے کی گہری خندقوں' آنکھوں کے نیچے گوشت کے ابھرے ہوئے حلقوں اور سر کے آخری کناروں سے چپٹی ہوئی سفیدی مائل روئیدگی میں ڈھل جائے۔ آئینے میں دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا ہے جیسے میں برف کی ایک قاش اور رکا ہوا ایک لمحہ ہوں۔ کبھی میں بھی سیال وقت کی ایک ایسی رو تھا جو دشت و جبل اور بحر و بر کو عبور کرتی بڑھے ہی چلی جاتی تھی۔ لیکن اب وہ بات کہاں؟ سیال مادہ کبھی لوہے کے کسی سانچے میں قطرہ قطرہ گرا ہو گا۔ اس کے بعد زمانے نے اسے آگ کے قریب نہیں آنے دیا۔ پہلے اس کی سطح پر پپڑی سی جمی' پھر یہ آہستہ آہستہ اندر

سے ٹھنڈا ہو تا گیا اور آخر سانچے کی عطا کردہ صورت میں پوری طرح ڈھل گیا۔ گویا جو خود کبھی وقت تھا' اب وقت کی زد میں ہے۔ ہوا کا ہر تھپیڑا اسے ٹھکرا کر آگے کو بڑھ جاتا ہے' لیکن لوہے کی یہ گیند ہر قسم کے احساس سے عاری ہے۔

عجیب بات ہے' جب جوانی کی منہ زور ندی چڑھتی ہے' انگ انگ تھرکتا ہے اور آنکھیں نشے میں ڈوب کر آئینے کی تلاش کرتی ہیں۔ یعنی جب انسان خود اپنے جسم کی لازوال سندرتا اور اپنے لہو کے طلسم میں گم ہو جاتا ہے تو پھر وہ باہر کی دنیا کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جوانی مجسم بغاوت ہے اور ہر جوان ایک الگ داستان ہے۔ اس داستان کو آپ کسی بنی بنائی کہانی کا عنوان نہیں بنا سکتے۔ یہ تو ایک طوفانی ندی ہے جو اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ پتھروں کو ہٹا کر' درختوں کو اکھیڑ کر' چٹانوں کو توڑ کر اپنے اندرونی ابال کے تحت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جوانی کو پامال راہوں اور پتھر کی دیواروں میں گھرے ہوئے آج تک کسی نے نہیں دیکھا! یہ تو ایک ایسی خوشبو ہے' جو لہو کے معمولی سے مدوجزر پر بھی ڈولنے لگتی ہے۔

لیکن پھر دیکھتے دیکھتے لہو ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور جسم کی تڑپ' نیز روح کی کلبلاہٹ سانچے میں مقید ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد کہیں سے خنک ہوا کا ایک جھونکا نمودار ہوتا ہے جو سیال مادے کو منجمد کر جاتا ہے۔ گلاب ایسے بے داغ چہرے پر پنجاب کے پانچوں دریا ابھر آتے ہیں۔ رد عمل میں ایک خاص میکانکی نظم و ضبط اور ایک مخصوص ٹھہراؤ در آتا ہے۔ حتیٰ کہ لباس' چال اور انداز گفتگو بھی ایک خاص نمونے میں ڈھل جاتا ہے۔ گویا جو شخص کبھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھا' اب انجمن کا ایک حقیر فرد ہے اور اس کی شکل و صورت' وضع قطع اور انداز نظر خود انجمن نے اپنی اکیڈمی یا کارخانے میں ایک خاص ضابطے کے تحت از سرنو مرتب کیا ہے۔ پہلے یہ شخص ایک کردار تھا' اب وہ ایک ٹائپ ہے۔ لیکن ڈھلنے کا یہ عمل اس قدر آہستہ رو ہوتا ہے کہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ ایک بھلا چنگا آدمی جس کی باتوں میں ایک عجیب رس اور جس کے انداز میں ایک انوکھی تازگی تھی کب اپنی ان صفات کو ترک کر کے مشین کا ایک پرزہ بن گیا۔ ہاں' اگر درمیان میں فراق کا ایک طویل وقفہ حائل ہو جائے تو تبدیلی کا ایک گہرا احساس دل کو ضرور کچوکا لگائے' بعینہ جیسے آئینے میں جھانکتے ہی میرے دل پر چوٹ پڑی ہے۔ ویسے مجھے اپنی زندگی میں ہربار ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جب میں نے دیکھا ہے کہ کردار قطعاً غیر ارادی طور پر ٹائپ میں مبتدل ہو گیا۔ مثلاً جب میرا دوست م کالج میں تھا تو کس قدر زندہ دل' بے پروا اور ہر ضابطے سے بے نیاز تھا۔ گھنٹوں اس نے میرے ساتھ مل کر معاشرے کو بدلنے کے پروگرام بنائے اور خدا سے لے کر جمہوریت تک ہر چیز کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ پھر کالج کے ایام ختم ہو گئے۔ زمانے کی ایک ہی موج نے اسے کہیں اور مجھے کہیں پہنچا دیا۔ درمیان میں بیس پچیس گرد آلود سال حائل ہو گئے۔ پھر شومئ قسمت سے مجھے کسی روز پھلروان' پنچو کی ملیاں یا کالا شاہ کاکو جانا پڑا اور وہاں کسی بوسیدے کا گھونگھٹ نکالے ہوئے ہوٹل' چیچک زدہ سڑک یا کسی مریل سی دکان پر میں نے اپنے اس جگری دوست کو دیکھا اور بمشکل اسے پہچانا۔ اب وہ حاجی صاحب تھے۔ لمبی داڑھی' شانے پر رومال' آنکھوں میں سرمہ' ماتھے پر ایک گہرا گھاؤ لیکن وہ مضطرب' ذہین اور باغی نوجوان کہاں گیا۔ اور م ایسے دوسرے ل' د' س اور ض کہاں چلے گئے؟ کوئی خان بہادر ہے' کوئی چٹی محرر ہے' کوئی زمیندار ہے' کوئی ساہوکار ہے' کسی نے مجسٹریٹ' تھانیدار یا پروفیسر کا لباس پہن لیا ہے اور کوئی بے یار و مددگار ہے' لیکن ان سب کی ذہنیت سماج کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے سانچوں میں ٹھنڈی ہو کر ایک مخصوص صورت میں بدل چکی ہے۔ ہر سانچے کا ایک مزاج ہے اور وہ اپنے اس مزاج کو ٹھنڈے ہوتے ہوئے مادے میں اس خوبصورتی سے منتقل کر دیتا ہے کہ جب بت ڈھل کر سامنے آتا ہے تو آپ اس سانچے سے نکلے ہوئے لاکھ دوسرے بتوں سے اسے متمیز کر ہی نہیں سکتے۔ یہی سانچے کا کمال ہے کہ وہ شعلے کو بجھاتا' بغاوت کو کچلتا اور انفرادیت کا قلع قمع کر دیتا ہے اور سیال شے کو ٹھنڈا کر کے ایک بت میں بدل دیتا ہے۔ یہ بت اب اپنے خاص گروہ کی اجتماعی ہیئت کی ایک تصویر ہے ـــــــ لوگ اس دار فانی میں آتے ہیں اور چند روز یہاں گزار کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں' لیکن سانچے سے نکلا ہوا یہ بت ازلی و ابدی ہے۔ آپ اسے ہر زمانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

مگر شاید سانچہ کہیں باہر سے نازل نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص اپنا سانچہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ شروع شروع میں جب خون کی حدت تیز تھی تو یہ سانچہ اپنا کام بخوبی سرانجام دینے سے معذور رہا' لیکن جب سورج نصف النہار سے نشیب کی طرف لڑھکا تو سانچہ گویا گرم ہو گیا اور آپ بڑی خاموشی سے اس میں ڈھلتے چلے گئے اب اگر آپ کے سر پر بھاری عمامہ اور منہ پر داڑھی ہے۔ اگر آپ کے گلے میں تعویذ اور مزاج میں جھلاہٹ ہے یا آپ ڈھیلی ڈھالی اچکن میں ملبوس بجھے بجھے چلے جا رہے ہیں تو اس میں میرا یا میرے سماج کا بھلا کیا قصور ہے؟ یقین جانیئے' سماج تو آپ کے اندر ہے۔ اس نے ذرا دیر کے لئے اپنے پنجے کی گرفت ڈھیلی کی تھی کہ آپ پھدک کر پنجرے کے دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔ اب اس نے دوبارہ آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ بس' اتنی سی بات ہے!

(جوری ہے باری ہے)

انشائیہ

غزل

وزیر آغا

سیانوں، نجیبوں، ستاروں حتیٰ کہ ناقدین تک ۔ سے پوچھنے کا خطرہ مول لیا کہ غزل ---- یہ برق صفت، شعلہ جوالا، سیماب آساء صنف سخن کہاں سے آئی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی تشفی آمیز جواب نہ دے سکا۔ جواب دینا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ غزل تو چکنی مچھلی کی طرح ہے کہ ادھر ہاتھ میں آئی ادھر نکل گئی۔ سیانوں نے کہا کہ یہ فتنہ نہیں بلکہ عطر فتنہ ہے۔ اسے جگانا دیو دس کو چھیڑنا ہے۔ طبیب بولے کہ یہ لہو کے جوار بھاٹے کی پیداوار ہے۔ موسیقاروں نے کہا کہ ہمارے سُر اس کے منبع کی کھوج میں بار بار روانہ ہوئے مگر دو چار مرکیاں کھا کر ناکام و نامراد واپس آگئے۔ ناقدین بولے کہ جب ہرن کو تیر لگتا ہے تو اس کی بڑی بڑی آنسو بھری سیہ آنکھوں میں جینے کی حسرت جنم لیتی ہے۔ بس یہ حسرت ہی غزل ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ آج تک کوئی بھی اس کی جنم بھومی کا سراغ نہ لگا سکا۔ حد یہ کہ شعرائے کرام بھی جن کی قلم کی نوک پر یہ ہمہ وقت مچلتی ہے اس کی گزرگاہ حیات کی نشاندہی کرنے سے قاصر رہے۔ ایک نے تو یہ کہہ کر اپنی شکست بھی تسلیم کر لی کہ غزل غیب سے آتی ہے بالکل جیسے پہاڑ کے شگاف سے چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر تھوڑی دیر زمین پر سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا نیچے کسی کھڈ میں اتر جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بل کھانا ہی غزل کا وظیفہ حیات ہے!

یہ ساری قیاس آرائیاں اپنی اپنی جگہ برحق مگر جو نکتہ مجھے سوجھا ہے۔ وہ ان سب سے زیادہ برحق ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کی قید میں تھی، بالکل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی ہیبت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مگر یہ قید و بند کی بات بھی شاید درست نہیں۔ کیونکہ غزل تو قصیدے کا اٹوٹ انگ تھی۔ اس کی لاتعداد پسلیوں میں سے ایک پسلی تھی۔ مگر پھر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ڈھانچے سے منحرف ہو گئی۔ اس نے سوچا بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہمہ وقت زمین بوس ہوتے چلے جاؤ اور پھر قصیدے کو دیکھو کہ اس مرد دانا میں کوئی لچک یا پیچ جیسے تھا ہی نہیں۔ وہ تو بس سیدھی سڑک پر چلنے کا عادی تھا بالکل جیسے کوئی سپاہی لانگ مارچ کر رہا ہو۔ نہ ادھر نہ ادھر۔ بس سیدھا ناک کی سیدھ پر۔ پھر یہ کہ وہ محض حمد و ثنا کرتا ہی جاتا تھا اور خوگر حمد بھی ایسا تھا کہ تھوڑا سا گلہ کرنا بھی اس کے لئے عذاب جاں تھا کیوں کہ اگر قصیدہ اپنی عام روش سے ہٹ کر اپنے ممدوح سے معمولی چھیڑ چھاڑ کی جرات بھی کر بیٹھتا تو اپنا سر قلم کرا لیتا۔ لہٰذا وہ ہمہ وقت محتاط رہتا مگر غزل کو قصیدے کا یوں باادب باملاحظہ ہوشیار رہنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ قدرت نے اس کے وجود میں نہ جانے کتنی بڑی مقدار میں پارہ بھر دیا تھا کہ اس سے نچلا بیٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ وہ چاہتی کہ چہل کرے، شرارت سے قصیدے کے بھاری بھرکم لباس فاخرہ پر رنگوں کی پچکاری چھوڑ دے، کبھی حیا سے آنکھیں جھکا لے پھر آنکھوں کے کونوں سے ایک عجب انداز دلبری سے دیکھے۔ بات بات پر مسکرائے مگر قصیدہ بہت سنجیدہ تھا۔ وہ ایک بھاری عصا اٹھائے پھونک پھونک کر قدم رکھتا اور ہر قدم پر اپنے ممدوح کی حمد و ثنا کرتا آگے ہی آگے بڑھے چلا جاتا۔ دوسری طرف اس کے بدن میں چھپی ہوئی غزل اسے اندر سے چٹکی کے لگاتی، اسے تقدس کے ہالے سے باہر نکلنے پر اکساتی، اسے گناہ کی ترغیب دیتی۔ وہ غصے میں لال انگارہ بنا اپنے اندر اتر جاتا تاکہ غزل کو اس کی جرات رندانہ کا مزہ چکھائے۔ مگر اندر داخل ہوتے ہی وہ جھڑکیاں دینے کے بجائے غزل پر پند و نصاح کی بوچھار کر دیتا ---- غزل کچھ دیر تو بڑے احترام اور ادب کے ساتھ قصیدے کی باتیں سنتی، پھر یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ سو ایک روز قصیدہ نے سوچا کہ اس حرافہ کو اپنے بدن سے کاٹ کر پرے پھینک دے تاکہ وہ اندر کے مسلسل عذاب سے نجات پائے۔ تب اس نے خود کو باغ کی سب سے خوبصورت آپریشن ٹیبل پر لٹایا اور اپنے تیز ناخنوں سے خود ہی اپنا آپریشن کر ڈالا اور یوں غزل کو ایک ناکارہ پسلی کی طرح اپنے جسم سے کاٹ کر پھینک دینے میں کامیاب ہو گیا اور غزل کو دیکھو کہ اس نے اس بات کا ذرا برا نہ مانا بلکہ اپنے خداوند کا شکر ادا کیا کہ اسے اپنے مجازی خدا کی قید سے نجات مل گئی۔

مگر یہ نہ سوچو کہ قصیدے سے الگ ہو کر غزل اپنے مزاج سے بھی دست کش ہو گئی۔ جی نہیں! مزاج سے دست کش ہونا تو ایک طرف اس نے قصیدہ سے دست کش ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ فرق محض یہ پڑا کہ وہ پہلے اندر سے قصیدے کو کچوکے لگاتی تھی اب باہر سے لگانے لگی۔ اس نے دیکھا کہ قصیدے نے خوشامد اور مبالغہ آرائی کے علاوہ دست طلب دراز کرنے کی عادت بھی اپنا رکھی تھی سو اس نے ان تینوں کی مذمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ قصیدہ زہد و اتقاء' عظمت و جبروت' بہادری اور فیاضی ایسی صفات کو پسند کرنے کا عادی تھا۔ غزل نے زہد کو للکارا اور عظمت و جبروت کا منہ چڑایا اور پھر ایک رادھا کی طرح مرلی کے گرد رقص کرنے لگی۔ وہی لاگ' وہی لگاوٹ وہی لجانا' وہی اترانا ------

اس نے قصیدے کی اتنی چٹکیاں لیں کہ بیچارہ زچ ہو کر رہ گیا۔ مگر پھر قصیدے کے اندر بھی ایک انقلاب آگیا۔ اس نے بادشاہوں اور امیروں کی حمد و ثنا کا پیشہ ترک کر دیا اور چپکے سے غزل کے در پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت امراؤ جان ادا کے مرزا صاحب ایسی ہو گئی' جس کی شادی کا جوڑا خانم نے تار تار کر دیا تھا یا شاید ا۔ ملی زولا کے ناول NANNA کے اس فرانسیسی جرنیل ایسی جو طوائف کی فرمائش پر حسن کارکردگی کے تمغوں سمیت فرش پر اوندھے منہ لیٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ گویا قصیدہ کا زوال تھا۔ اس کے بعد وہ اپنا کل اثاثہ ------ اپنا تکلم' شکوہ اور پرپرواز غزل کے سپرد کر کے اس کا بے دام غلام ہو گیا۔

اور یوں غزل اور قصیدہ کا ایک بار پھر سنجوگ ہوا۔ فرق یہ پڑا کہ پہلے غزل قصیدے کا اٹوٹ انگ تھی۔ اب قصیدہ غزل کا اٹوٹ انگ بن گیا۔ قصیدے کے سینے میں غزل کی حیثیت خواہش گناہ ایسی تھی۔ قصیدے نے متعدد بار اس خواہش کی سرکوبی کے لئے قدم اٹھایا تھا مگر آخر آخر اس کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ پھر ایک روز خواہش گناہ نے قصیدے کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور اپنے لئے ایک ایسی نئی دنیا بسالی جس میں نغمہ بھی تھا' شراب بھی' لذت بھی اور اذیت بھی مگر اب کہ قصیدہ غزل کا جزو بدن بنا تو غزل کو اندر کے کسی کچوکے کا سامنا نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ قصیدہ تو ایک عضو معطل تھا۔ اس میں پسلی کی چبھن قطعاً ناپید تھی وہ تو بس گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جس کا کام دانہ دانہ تسبیح روز و شب کا شمار کرنا اور معاوضے کے طور پر کچھ مراعات بصورت نقدی یا منصب حاصل کرنا تھا! ------ مگر پھر یوں ہوا کہ غزل نے قصیدے سے یہ دونوں باتیں ہتھیالیں' بجا کہ اس نے اپنا ممدوح کسی بادشاہ یا امیر کو نہ بنایا مگر اس کے بجائے ایک نرم و نازک محبوب کو ضرور بنا لیا۔ وہ اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں رطب اللسان ہوئی اور پھر معاملہ بندی کے میدان میں غلو کی حد تک پیش قدمی کرتی چلی گئی۔ معاوضہ کے طور پر اس نے محبوب کی نظر التفات اور شربت وصل کا مطالبہ کیا اور محبوب کو دیکھو کہ اس نے پلک جھپکنے میں بادشاہ یا امیر کا منصب سنبھال لیا۔ دروازے پر دربان متعین کیا اور نوک زبان کو مغلظات سے لیس کر دیا۔ پھر جب ذرا جوش مدھم پڑا اور اس نے دیکھا کہ زمانے کا چلن بھی بدل رہا ہے تو دربان کو چپکے سے رخصت کر دیا اور مغلظات سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر ان کی جگہ رعب حسن اور گل افشانی گفتار کو عطا کر دی' یوں اس نے اپنا سکہ جمائے رکھا۔

اور قصیدے کو دیکھو کہ اس نے غزل سے کیسا انتقام لیا کہ اس کی تخیل آفرینی' چہل' شرارت' لطافت اور ملائمت' ان سب کو زہد و اتقاء' مطلب براری' خوشامد اور شکست انا کی دبیز تہہ سے ڈھانپ دیا۔ لہٰذا غزل بھی قصیدے کی طرح رسوائے زمانہ ہو گئی۔ قصیدہ گو دربار کی بو پا کر طویل سفر کرتا تھا' اب غزل گو مشاعرے کی بو پر اندرون ملک اور بیرون ملک ہر اس جگہ پہنچا جہاں اس نے خوان یغما بچھا ہوا دیکھا اور نقدی سمیٹنے کا موقع پایا۔ اس نے اپنے لئے نئے نئے دربار تلاش کر لئے اور زمین بوس ہونے کے لئے نئے نئے آسن ایجاد کر لئے اور اب صورت حال یہ ہے کہ غزل کا سراپا پھر سے قصیدے کی خلعت میں محبوس ہے۔ یہ نہیں کہ غزل کی چمک دمک میں کوئی کمی آگئی ہے۔ غزل کی چمک دمک بدستور موجود ہے مگر جس طرح بعض اوقات گہرے بادل کی تہوں میں بجلی چمکتی ہے مگر بادل بجلی کو عیاں ہونے کی مہلت نہیں دیتا' بالکل اسی طرح اب غزل قصیدے کی موٹی کالی عبا میں ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے اور اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ مگر میں غزل سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جس روز اسے بادل میں چھوٹا سا شگاف بھی دکھائی دیا اس میں سے ایک پہاڑی چشمے کی طرح ابل کر ضرور باہر آجائے گی۔ آسمان سے اتر کر پھر سے زمین پر چہل قدمی کرنے لگے گی (سمندر اگر میرے اندر گرے)

نئی نسل کے ممتاز منفرد غزل گو

پروین کمار اشک

کی غزلوں کا دوسرا خوبصورت مجموعہ

چاندنی کے خطوط

منظر عام پر آگیا۔

منتخب نظمیں ـــــ وزیر آغا

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
یہ نہ سوچا
کہاں سے چلا تھا' کہاں آ کے ٹھہرا
میں کِس منزلِ بے نشاں کی طرف اب رواں ہُوں؟
مجھے خشک' بد رنگ چمڑے پہ لکھے سوالوں سے رغبت نہیں تھی
مَیں منطق کی ورزش سے خود کو تھکانا نہیں چاہتا تھا

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور دیکھا
فلک کی سیہ' گہری' سُوکھی ہوئی باولی سے
کروڑوں ستارے
شعاعوں کی بے سمت' بے لفظ' گونگی زباں میں
لرزتے لبوں سے
"نہ ہونے" کے منکر تھے
ہونے کا اعلان کرتے چلے جا رہے تھے!
فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بیتاب پھُولوں سے' ساون کے جھُولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی:
مجھے اپنے "ہونے" کا حق الیقیں ہے
مَیں اعلان کرتی ہوں اپنا!

عجب سلسلہ تھا
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم
صداؤں کی' لہروں کی اک چیختی نشرگہہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا

یہ اعلان کِس کے لئے تھا؟
تخاطب کا رُخ کون سی سمت میں تھا؟
مجھے کیا خبر ہے!
مَیں اس نشرگہہ کا فقط ایک ادنیٰ ملازم
مَیں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں!!

(نرواں)

آدھی صدی کے بعد !

معاً مَیں نے
پُھولوں کے گجروں کی درزوں سے دیکھا
مَیں ندیوں کے جُھرمٹ میں محصُور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا
پیازی سے گالوں کے
بلوّر میں
میرا چہرہ چُھپا تھا
چمکتی ہُوئی سُرخ بندیا
مرا نام جپتی تھی
خوشبُو
گلابی لبادوں سے باہر نکل کر
مجھے سونگھتی تھی
لبوں سے ٹپکتے ہُوئے بول
مصری کی ڈلیاں تھے
کانوں میں گُھل کر
مرے تن کی شریانوں
ننھی رگوں تک کو
میٹھی تمازت سے مسحُور کرتے تھے
چاروں طرف

ریشمیں ڈوریاں، ندّیاں
مجھ کو تھامے کھڑی تھیں
مرے سامنے
ایک بانکا، چنچل، تیز دریا تھا
دریا
جو ریشم کا دھاگا تھا
سوزن تھا
اپنے ہی دونوں کناروں کو
پیہم رفو کر رہا تھا
زمیں کے اُدھڑتے ہوئے چاک کو
سی رہا تھا!

(آدھی صدی کے بعد)

شام

شام، تری مہکار عجب ہے!
دُور افق سے آنے والا
ہر آوارہ حال پرندہ
تیری نازک شاخوں، مخمل پتّوں کی خواہش میں
کتنا ظالم کس درجہ خونخوار ہُوا ہے!
شام، پرندوں کی ڈاروں سے لڑتے لڑتے
تیرا بھی کیا حال ہُوا ہے!

شام اگر تُو دُلہن ہوتی
چمکیلی زربفت کی ساڑھی تجھ پر سجتی
پات، وداع کے گیت سُناتے
اور ہَوا شہنائی بجتی
سارے دُکھ اور سارے سُکھ
باراتی ہوتے
سُورج کے پلّو سے بندھ کر
تُو جانے کس دُور نگر کی جانب جاتی
شبنم ایسے آنسو بوتی
شام، اگر تُو دُلہن ہوتی!

شام، ترا کیا حال ہُوا ہے!
ہر اک تجھ پر جھپٹ رہا ہے
ہر شے تجھ کو نوچ رہی ہے
تارے، اپنے پنجوں سے
اور پنچھی، اپنی چونچوں سے
اور سُورج، اپنے بھالوں سے
اور انساں؟
وہ بے چارہ، اک ازلی بنجارہ
خود تیرا بہروپ بنا ہے
اپنے لہولہان بدن کو
تیری قبا سے ڈھانپ رہا ہے
تیری طرح، وہ خود بھی تھر تھر کانپ رہا ہے!!

(گھاس میں تتلیاں)

اندھی کالی رات کا دھبّہ

اونچی نیچی دیواروں میں گھِرے ہُوئے
تُم اتنے ہراساں، اتنے تنہا
پہلے کب تھے؟

جاؤ پھر سے کھاٹ پہ لیٹو
ٹکٹکی باندھ کے اُس کو دیکھو
کتنا بے بس، کتنا بھیانک، کتنا تنہا!
ڈولتا پیسہ، کھوٹا سکّہ، اندھی کالی رات کا دھبّہ
تُم نے اس دھبّے کو اب تک پیشانی کی شوبھا سمجھا
اور اب خالی برتن بن کر چیخ رہے ہو!

بولو، اپنے ہونٹوں پر کوئی شبد سجاؤ
منتر جاپو، ہاتھ اٹھا کر پڑھو دُعائیں
چہرہ دھو کر، سیدھے ہاتھ کی اُنگلی کے یاقوت میں جھانکو
بولو، تُم نے کیا دیکھا ہے؟

صدیوں تم نے اُس کو چاہا
اُس کی سیمیں اُنگلی تھامی، چلنا سیکھا
اُس کے ٹھنڈے نورانی چھتنار کے نیچے
گھاس پہ لیٹے
دودھ بھری کرنوں میں نہائے
پیار بھری آنکھوں میں جھانکا!

اور اب کیا ہے؟
اِک نقطہ، اِک ڈولتا پیسہ، اندھی کالی رات کا دھبّہ
نیستی کا پیکر، بے رنگی کا مظہر، تنہا!
اس کو اب تُم کیا دیکھو گے
دیکھا بھی تو
اپنے ہی اندر جھانکو گے!!

(دن کا زرد پہاڑ)

یہی اپنا ٹھکانہ ہے!

ستارہ جیسے آنسو ہے
تری پلکوں پہ آ کر رُک گیا ہے، تجھ سے کہتا ہے:
یونہی بس دو گھڑی رُک لوں ------ تو چلتا ہوں
مجھے بھیگی ہوئی کچھ اور پلکوں پر بھی جانا ہے
مسافر ہوں، مسافر کا بھلا کوئی ٹھکانہ ہے!

ستارہ اک مسافر ہے
ابھی کچھ دیر وہ مہماں ہے تیرا
پھر اس کے بعد ------ جب کالی رات کی پلکوں پہ چمکے گا
سحر دم، اوس بن کر پھول (کی)
آنکھوں میں اُترے گا
پھر اس کے بعد ------ گہری گھنیری
شام آئے گی
تو وہ بھی ساتھ آئے گا
معاً دیکھے گا مجھ کو
اور پھر یک دَم پَروں کو جوڑ کر
اک تیر کے مانند جھپٹے گا
مری بھیگی ہوئی پلکوں پہ اُترے گا
اُتر کر پَر سمیٹے گا
کہے گا بس یہی منزل تھی میری
اسی بستی میں آخر ایک دن ہم سب کو آنا ہے"
یہی اپنا ٹھکانہ ہے!!

(اک کتھا انوکھی)

اُجڑتا شہر

سیہ رُو قلندر
عجب بے نیازی سے لوہے کا لمبا سا چمٹا بجائے!

کبھی کوئی تانگے کا گھوڑا، دہکتے ہوئے تیز چابُک سے ڈر
کسی گرم، چکنی سڑک پر ذرا لڑکھڑائے
تو اک نقرئی قہقہہ، چیخ میں ڈوب جائے!

کبھی چہچہاتے ہوئے ننھّے بچّوں کی ٹولی
پُرانی سی اک بس کے پنجرے سے نِکلے
گلی کے کُھلے مُنہ میں چُپکے سے اُترے
اُدھڑتی ہوئی اک عمارت کے اندر پہنچ کر معاً ٹوٹ جائے!
کبھی کوئی ریلا لڑھکتے ہوئے سائیکلوں کا
کسی کالے دھبّے سی منزل کو بڑھتا ہی جائے
کبھی تیز رفتار موٹر کے یک دم ٹھہرنے
بریکوں کی اک کرب انگیز چیخ کے لاکھوں ٹکڑوں میں بٹنے کی
آواز آئے
کبھی چوک کی ایک صدیوں پُرانی، نم آلود کھڑکی کی چوکھٹ پہ
ٹھوڑی ٹکائے
کوئی زرد چہرہ ——— چھپی سُرخ آنکھوں کے زندان میں
بے قراری سے پھرتی ہوئی پُتلیوں کا تماشہ دکھائے
تماشہ مگر کون دیکھے؟

کبھی تُم جو دیکھو تو اِن پُتلیوں کے سمندر میں
اِس ٹُوٹے پھُوٹے ہوئے آئینے میں
تمہیں اپنی بکھری ہوئی ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا اک ہیولے
اُبھر کر بُلائے
اُجڑتے ہوئے شہر کا ایک منظر دکھائے!!

(شام اور سائے)

○

○

حرفِ تحسین

مشتاق احمد یوسفی

تقریر ہو یا تحریر' تنقید ہو یا تقریظ' نظم ہو یا انشائیہ' ڈاکٹر وزیر آغا ہر رنگ میں اپنے انداز قد سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو دلاویز نرمی' رچاؤ اور شائستگی ہے' زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح چاہا اور نباہا ہے وہ (ان کے انشائیوں کی) ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں وہ اس صنف ادب (ایسے) کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہ ہوگا۔

رشید نثار

وزیر آغا اپنے افکار کے حوالے سے اور فکری رجحانات کی بنا پر اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے لیجنڈ کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی غزل سماجی تاریخ بنانے کے تمام اوصاف رکھتی ہے۔ جہاں ان کی نظم میں قدیم انسان اور آغاز تمدن کے میلانات ملتے ہیں وہاں ان کی غزل شگفتن ذات اور انکشاف انسان کا درجہ رکھتی ہے۔

انتظار حسین

مجھے وزیر آغا کی خود نوشت "شام کی منڈیر سے" اچھی لگی اور اردو کی خود نوشتوں سے الگ اور منفرد نظر آئی۔ یہاں اس بنیادی انسانی رشتے کا اقرار ملتا ہے جو اردو کی گوناگوں آپ بیتیوں سے گم نظر آتا ہے ------- اس رشتے کا اقرار اور اس پر اصرار بس یہی وہ چیز ہے جس نے اس خود نوشت کو میرے حساب سے اس کتاب کو ایک بامعنی کتاب بنا دیا۔

غلام الثقلین نقوی

مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح (وزیر آغا) کے کردار کی من موہنی گمبھیرتا کو خوشبو ریز دیکھنا مقصود ہو تو ان کی نظم "آدھی صدی کے بعد" پڑھی ہوگی یا ان کی خود نوشت "شام کی منڈیر سے" کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لفظ لفظ سے دیہات کی خاموش پر سکون اور شبنم میں دھلی ہوئی صبحوں کا ملکوتی حسن چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اختر احسن

وزیر آغا کی طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" میں ایک ایسی کائناتی روح ہے جس کا انکار ممکن نہیں کیونکہ ایسا انکار خود اپنی حقیقت کا انکار ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" ایک ایسی طویل نظم ہے جس کے پڑھنے کے بعد قاری خود کو ایک منظوم ابدیت بن کر نظم کے صفحوں سے حقیقت کے صفحوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ قاری خود ایک طویل نظم بن جاتا ہے۔ یہ وزیر آغا کا فن ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

شاعر' ادیب' انشائیہ نگار' نقاد' صلاحیتوں کا وہ مجموعہ جس کا نام وزیر آغا ہے' اس سے بھی زیادہ بہت کچھ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

وزیر آغا نے اردو ادب کو ایک نئے انداز فکر سے آشنا کیا اور اس کے فروغ کے لئے انہوں نے جہاں فلسفہ' تاریخ' نفسیات' مذہبیات' دیومالا اور علم الانسان وغیرہ متعدد علوم سے استفادہ کیا وہاں اپنے اسلوب کی تازہ کاری سے اظہار کی ایک ایسی تکنیک بھی خلق کی جس میں موضوع کی توانائی داخلی طور پر اور اظہار کی ندرت خارجی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

WAZIR AGHA's 'A TALE SO STRANGE'

ROBERTA GOLDSTEIN
(U.S.A)

WAZIR AGHA in his apocalyptic poem (A TALE SO STRANGE) has created a tale to remember. His intensely vivid imagery and use of symbolism swiftly involve our mind senses and spirit in this gripping tale of doom. WAZIR AGHA is indeed a poet of honour and distinction. I have great hope that many people will read this soul-stirring subject and will find their spiritual strength rejuvenated.

DR WERNER MANHEIM
INDIANA UNIVERSITY(U.S.A).

WAZIR AGHA'S long peom A TALE SO STRANGE is a powerful demonstration of modern man's loss of spirit and of his failure to fulfill his task on earth. It is a marvellous document about the weakness of modern man and his lost opportunities. Wazir Agha's metaphors are beautiful and to the point and so is his English and its poetic sound.

DANAE PAPASTRATU
EDITOR 'OERIHRAMMA'
GREECE

WAZIR AGHA's poem A TALE SO STRANGE has touched me deeply. I intend to translate it into GREEK and present it in a book-form.

Prof: CHARLES CLINE(U.S.A)

The sweep of Wazir Agha's poem against the terse lines and flowing stanzas is truly amazing: Control releasing powerful expression, beauty artistically compensating for the holocaustic message of the poem. These dichotomies enhance as well as transmute, making for an admirable achievement.

VIRGINIA RHODAS DIRECTOR
"INTERNATIONAL POETRY LETTER"
ARGENTINA.

WAZIR AGHA's 'A TALE SO STANGE" is a beautiful poem from which a 22 fragment has been translated and published into spanish in International poetry letter.

ROSEMARY C. WILKINSON
SEC.GEN.WORLD ACADEMY OF ART AND CULTURE
(USA)

I admire Wazir Agha's A TALE SO STRANGE very much.

HULDA WEBER(U.S.A)

A TALE SO STRANGE is wholly creative and metaphysical in thought and theme. Wazir Agha's invidivual insight forms its own vision - of man lulling himself into a dreamstate -- subconsciously surviving evil. Emerging into a future that may evolve to a brave new would' or end as it began ------"Karma or NIRVANA" -----"EDEN OR EXPULSION".

GEOFREY C. PARSONS
(AUSTRALIA).

The mystic inner being and the degradation of the outer world are dramatically interwoven with lyrical lucidness in WAZIR AGHA's A TALE SO STRANGE. The framing of this poetic work is heightened by the grandeur of imagination and reality.

SANDRA FOWLER(U.S.A).

WAZIR AGHA's poem " A TALE SO STRANGE" is a search for the answers to some of life's most complex and perplexing questions even though the answers for finite human beings must, for the most part, remain unanswerable. It is the knowledge that there will always be beautiful,unanswerable questions that makes the poet's search so poignant and memorable.

تابش دہلوی

یہ مجھ سے کِس طرح کی ضد دلِ برباد کرتا ہے
میں جس کو بھولنا چاہوں اُسی کو یاد کرتا ہے

قفس میں جس کے بازو شل ہوئے رزقِ اسیری سے
وہی صیدِ زبُوں صیاد کو صیاد کرتا ہے

طریقے ظلم کے صیاد نے سارے بدل ڈالے
جو طائر اُڑ نہیں سکتا اُسے آزاد کرتا ہے

اُفق سے دیکھ کر رعنائیاں ہم خاک زادوں کی
زمیں بوسی کی کوشش چرخِ بے بنیاد کرتا ہے

تھپیڑے وقت کے کتنے سبق آموز ہوتے ہیں
زمانہ بھی تو کارِ سیلیٔ استاد کرتا ہے

ستم اہلِ جہاں کا حوصلہ دیتا ہے جینے کا
وہ بارِ غم اُٹھانے میں مری امداد کرتا ہے

وہ جُوئے شیر ہو یا جُوئے خوں دونوں برابر ہیں
کہ اِن دونوں کو جاری تیشۂ فرہاد کرتا ہے

کیا تھا خُلد میں ابلیس نے گمراہ آدم کو
اب آدم زاد کو گمراہ آدم زاد کرتا ہے

دلِ ویراں میں تابش کیوں تمنائیں بساتے ہو
بڑے ناداں ہو، صحرا بھی کوئی آباد کرتا ہے

اکبر حمیدی

نعرے ہیں نعرۂ مستانہ نہیں ہے کوئی
بات یہ ہے یہاں میخانہ نہیں ہے کوئی

سب نے بہروپ بنا رکھے ہیں دیوانوں کے
ورنہ اس شہر میں دیوانہ نہیں ہے کوئی

یونہی چپ چاپ سبھی بھرتے چلے جاتے ہیں
جو چھلک جائے وہ پیمانہ نہیں ہے کوئی

امتیازات نہیں اچھے کسی نام سے ہوں
گھر کے افراد ہیں بیگانہ نہیں ہے کوئی

شوقِ سجدہ لئے پھرتا ہوں جبیں میں اکبرؔ
آستانِ درِ جانانہ نہیں ہے کوئی

انوار فیروز

صداقت کا عَلَم لے کر چلا ہوں
جہانِ تیرگی پر چھا گیا ہوں

ہزاروں آہٹیں سوئی ہیں جس میں
اسی گنبد کی میں اونچی صدا ہوں

یہ قربت بھی عجب اک حادثہ ہے
کہ تیرے پاس بھی رہ کر جدا ہوں

میں تیرے نام سے واقف نہیں ہوں
مگر میں پھر بھی تجھ کو جانتا ہوں

مرے اندر کئی طوفاں چھپے ہیں
صداؤں سے میں سر ٹکرا رہا ہوں

نیا سورج اندھیروں میں گھرا ہے
میں اکثر آجکل یہ سوچتا ہوں

نہ جگنو ہے نہ روزن ہے نہ در ہے
میں کس جنگل میں خود کو ڈھونڈتا ہوں

اندھیرے ہیں مری قسمت میں لیکن
طلوعِ انساں کے ماتھے پر رہا ہوں

میں پتھر ہوگیا ہوں کیا خطا تھی
کہ اپنے بوجھ کے نیچے دبا ہوں

مجھے انوار طوفاں کا بھی ڈر کیا!
میں اِک کوہِ گراں بن کر کھڑا ہوں

بشیر سیفی

ریگِ رواں پہ نقشِ وفا ڈھونڈتے رہے
میں جا چکا تو میری صدا ڈھونڈتے رہے

میں جاں بہ لب تھا جس گھڑی اپنے مکان میں
جھونکے ہوا کے شہر میں کیا ڈھونڈتے رہے

ہم کو تو چند روز بھی جینا محال ہے
وہ کون تھے جو آبِ بقا ڈھونڈتے رہے

اس طرح تیری یاد میں خود کو گنوا دیا
تاعمر ہم کو ارض و سما ڈھونڈتے رہے

سیفی رہِ حیات میں اپنا جسے کہا
وہ درد دے گیا کہ دوا ڈھونڈتے رہے

مستحسن خیال

ہمیں اتنا یقیں ہے کہ اندھیرے مات کھائیں گے
ہم اپنے خونِ دل سے جب چراغِ فن جلائیں گے

میں کہتا ہوں، غزل کی شاخ اس دن سوکھ جائے گی
ہم اپنے خواب کی جس دن کوئی قیمت لگائیں گے

اندھیروں کے پرستارو، یہ حرفِ آگہی سن لو
جو آنسو جذب ہیں مٹی میں، وہ سورج اگائیں گے

تمہارے راستے میں خاک ہو کے جو بھی بکھرے ہیں
جہاں جاؤ گے تم، یہ بھی تمہارے ساتھ جائیں گے

کسی کے پاس ہوں گے خواب تارے اور تعبیریں
کسی کی خواب گوں پلکوں پہ ستارے جھلملائیں گے

نہ کر مسدود راہیں ہم پہ یوں شہرِ تمنا کی
ہم اس کے در پہ دستک دے کے واپس لوٹ آئیں گے

○●○

عبدالمنان ناہید

تھی کبھی، آج زندگی کیسی
کل کے پھولوں میں تازگی کیسی

نرم و نازک زبان رکھتے ہو
بات میں یہ کرختگی کیسی

خود فروشی میں یہ انا کیا ہے
بندگی میں یہ خواجگی کیسی

انکی آواز اس میں ہے شائد
شعر میں ہے یہ نغمگی کیسی

میں نے کہدی اگر خدا لگتی
چوٹ واعظ پہ جا لگی کیسی

کفر و ایماں تو اپنا اپنا ہے
تیری میری کبیدگی کیسی

سارے شمس و قمر نجوم ترے
پھر مرے گھر میں تیرگی کیسی

سرد برسات اور ٹھنڈی ہوا
دل میں ہے آگ سی لگی کیسی

دو قدم پر ہے منزلِ جاناں
اب یہاں پاشکستگی کیسی

تم تو دل کو لٹا چکے ناہید
آج پھر دل گرفتگی کیسی

شہاب صفدر

زمانے سے ابھی ہم عشق کے تمغے چھپاتے ہیں
تری تصویر، تیرے خط، ترے تحفے چھپاتے ہیں

نہ جانے کیسی اُلجھن ہے؟ ریاضی کی کتابوں میں
لکیریں کھینچ کر اک نام کے نقطے چھپاتے ہیں

یہاں ظاہر لبِ قرطاس داغِ روشنائی بھی!
سرِ دامن، اُدھر وہ، خون کے دھبے چھپاتے ہیں

تم اپنی سوچ کو "واوین" میں کیوں بند کرتے ہو؟
یہاں شہرت کی خاطر لوگ تو مصرعے چھپاتے ہیں

یہ کیسے تو نے غم بانٹے کہ تجھ سے تیرے عاشق بھی
کسی مقروض کی مانند اب چہرے چھپاتے ہیں

چلو مضروب ٹھہریں منقسم ہونے سے پہلے ہی
اسبابِ ندامت، خون کے چھینٹے، چھپاتے ہیں

شہابؔ آنکھیں کھلی رکھنا کہ اب نقاد بھی سارے
معائب ڈھونڈتے ہیں اور فن پارے چھپاتے ہیں

○

نظم و ضبطِ زندگی زینہ بہ زینہ آگیا
شہر کو صحرانوردی کا قرینہ آگیا

کیا خبر تھی اک بھنور تھا جانے کب سے منتظر
ہم تو سمجھے تھے کہ ساحل پر سفینہ آگیا

میری صورت میں شکن اندر شکن یہ کون تھا
آئینہ دیکھا تو ماتھے پہ پسینہ آگیا

یہ خبر کیا تھی کہ ڈھ جائیگا شہرِ آرزو
اہلِ دل سمجھے تھے ساون کا مہینہ آگیا

ہر صلیب و دار و مقتل سے یہ آتی ہے صدا
جن کو مرنا آگیا ہے اُن کو جینا آگیا

جن پہ ساقی نے توجہ کی نظر ڈالی سراجؔ
ان کو بے جام و سبو محفل میں پینا آگیا

○

عابد رضا شکیب

یہ سختیِ حالات تہہِ سنگ کہاں تک
بدلے گی زمانے کی فضا رنگ کہاں تک

سازوں سے ابھرنے لگی زنجیر کی آواز
آشفتگیِ وقت کا آہنگ کہاں تک

ہر لمحہ بدلتا ہے شعورِ غمِ ہستی
برداشت کریں لوگ ترا ڈھنگ کہاں تک

چہرے کو کسی دیدۂ شفاف میں دیکھیں
آئینے سے اترے گا بھلا زنگ کہاں تک

اس عرصۂ بازار میں رنجش کی ہوا سرد
سینوں میں رہیگی روشِ جنگ کہاں تک

مانا ترے کوچے میں ہے ہنگام گدائی
گلیوں کو کیا جائے مگر تنگ کہاں تک

انجم جاوید

وقت گہرے نشان چھوڑ گیا
آئینے پر چٹان چھوڑ گیا

نامکمل سا خواب دیکھا تھا
عمر بھر کی تکان چھوڑ گیا

جاتا لمحہ عجب شکاری تھا
ذہن پر اک مچان چھوڑ گیا

زخمی ہاتھوں نے پھول توڑا تھا
خون اپنا نشان چھوڑ گیا

رو رہی تھیں ہوائیں جنگل کی
اک پرندہ مکان چھوڑ گیا

وہ بھی کیا شخص تھا کہ تیروں کو
ہاتھ میں بے کمان چھوڑ گیا

بے زمینی کا دکھ اٹھانے کو
کھیت اپنے کسان چھوڑ گیا

نثار ترابی

سب چکوروں کے سفر میں پَر کٹے رہ جائیں گے
چاند کو چھونے کی دُھن میں، رابطے رہ جائیں گے

لال آندھی کا حوالہ، اے ہوا دینا نہیں
شاخ پر بیٹھے پرندے، چیختے رہ جائیں گے

کوئی سپنوں کے نگر سے لوٹ کر آتا نہیں
اُس کی ماری نظر میں رُت جگے رہ جائیں گے

کِس نے سوچا تھا کہ منزل پہ پہنچ کر اِس طرح
راستوں میں کھو کے خود ہی راستے رہ جائیں گے

کب یہ اُڑتے رنگ ہوتے ہیں اسیرِ آرزو
تتلیوں کے پیچھے بچّے بھاگتے رہ جائیں گے

جب بھی اُس کے ساتھ گزرے وقت کی یاد آئے گی
آنکھ میں کتنے ہی منظر جھانکتے رہ جائیں گے

ایک دن آئے گا یادوں کی کتابوں میں نثارؔ
حرف مٹ جائیں گے لیکن، حاشیے رہ جائیں گے

○

قاسم شاہ

○

تُو مجھے اپنے برابر بیٹھنے دیتا نہیں
یہ روّیہ مجھ کو اکثر بیٹھنے دیتا نہیں

سانپ کہتا تھا میں بچوں کا تماشا بن گیا
پھر بھی یہ بوڑھا گداگر بیٹھنے دیتا نہیں

قرطلہ سے مانگتا پھرتا ہوں پانی اے خدا
چھ مہینے کا یہ اصغر بیٹھنے دیتا نہیں

وہ مرے پَر کاٹ کر کہتا ہے اُڑ کر تو دکھا
سر پٹختا ہوں زمیں پر بیٹھنے دیتا نہیں

اب تو بیٹھک میں پڑا رہتا ہوں اُکتایا ہوا
مر گیا وہ زہر جو گھر بیٹھنے دیتا نہیں

○
○
○

جمشید مسرور (ناروے)

جہان بحر ہے
رستے حباب
مسافرت کا زمیں پر عذاب
زمین مُرد ہے دستِ ہوا نہ شاخِ گلاب
وہی ہے کل کے وہی آج کے سفر کا حساب
بنا نہ حلقۂ بازو اٹھی ہوئی شمشیر
چلا نہ جنبشِ ابرو کا تیر
بدن کھُلا نہ عیاں ہو سکا زرِ پہلو
رکا رکا رمِ آہو
تھکے تھکے سے بدن کی تھکی تھکی خوشبو
وہ ایک کمرۂ تاریک
نہ رقص کے لئے موزوں نہ پیار کے لئے ٹھیک
وہ لین دین عجب تھا سوال تھے نہ جواب
جمالِ زر پہ لُٹا پھر زرِ جمال اُس کا
فقط نگاہ پہ ناچا نہ شعلۂ رنگ شباب
رہے گا کل بھی مگر شوق کو خیال اُس کا
تمام زہر پلا دے مجھے بہاروں کا
اُتر گیا مری رگ رگ میں کل جو رات گئے
وہ آرزو نہیں سیماب ہے ستاروں کا
کٹے نہ کاٹ کہیں دیکھنا
لگے نہ پاٹ کہیں دیکھنا
جنوں کو اب کے نہیں حوصلہ کناروں کا

احساس

آفتاب حسین امبر

مجھے تجھ سے نہیں شکوہ فقط ان موسموں سے ہے
شکایت ہے اگر کچھ تو مقفل کھڑکیوں سے ہے

میرے احساس نے خالی تیری بانہیں تو چھولی ہیں
نہیں جو تو تیری بانہوں میں گلہ ان چوڑیوں سے ہے

کبھی جو بچپنے میں کھیل کے دوران سنتے تھے
محبت اب بھی مجھ کو ریل کے ان سیٹیوں سے ہے

کسی کے وعدے پہ ہر شب اچانک جاگ جاتا ہوں
کہ میرا واسطہ کچھ فون کی ان گھنٹیوں سے ہے

وہ اگلی بار آئے گا تو امبر اس سے کہہ دوں گا
کہ اس کی ذات کا چرچا کچھ اس کی شوخیوں سے ہے

ایک مکمل لمحہ

حمیرا رحمٰن (نیویارک)

ہم نے عمر کے اتنے سال
گزارے اپنے ساتھ
خوش، بے رونق، افسردہ
حیراں، ناراض، عجیب
لیکن تیرے ساتھ گزرنے والا یہ پل
ایک مکمل لمحہ ہے
جس میں محسوسات کے
ان سارے رنگوں کی بارش
ایک ہی پھوار میں
ہم پر برس گئی ہے

"یقیں دلا دو"

نسرین گل

میں جانتی ہوں
تری محبت مرے لئے ہے
میں تیری سنگت میں
زندگی کی ہر ایک منزل کو پا سکوں گی
ہر ایک مشکل کو سہہ سکوں گی
مگر! مری جاں!
کبھی کبھی جب یہ سوچتی ہوں
کہ تیری چاہت بھی موسموں کی طرح
کوئی اور رنگ بدلے
تو کیا کروں گی؟
یقیں دلا دو
"کہ تم مرے ہو"
بہار بن کے سدا رہو گے
مرے چمن کے ہر ایک گُل میں
خزاں سے مجھ کو پناہ دو گے
یقین دلا دو
وفا کا مجھ کو یقیں دلا دو

جب ہم خوشبو کے ساتھی تھے

رضی الدین رضی

کتنے اچھے دن ہوتے تھے
جب ہم خوشبو کے ساتھی تھے
کوئی ہماری آنکھوں پر ہاتھوں کو رکھ کر
پوچھتا تھا
"میں کون ہوں بوجھو"
اور ہم جو خوشبو کے ساتھی تھے کہہ دیتے تھے
"تم خوشبو ہو"
خوشبو یکدم ہنس دیتی تھی
کتنے اچھے دن ہوتے تھے

کتنے اچھے دن تھے خوشبو کو اپنے ساتھ لئے
جگنو کا پیچھا کرتے تھے
دن رات مہکتے رہتے تھے
کبھی خوشبو خود چھپ جاتی تھی
اور کبھی ہم اس سے چھپتے تھے
یوں آنکھ مچولی رہتی تھی۔
کتنے اچھے دن ہوتے تھے

کتنے اچھے دن ہوتے تھے جب خوشبو ہم سے پوچھتی تھی
"ہم بچھڑ گئے تو کیا ہوگا؟"
ہم اس کو بس یہ کہتے تھے
"چپ ایسی بات نہیں کرتے"
اور خوشبو سوچ میں کھو جاتی تھی
کتنے اچھے دن ہوتے تھے

اور پھر اک دن ایسا آیا
آنکھ مچولی کھیلنے والی خوشبو کو ہم خود کھو بیٹھے
(خوشبو آخر خوشبو تھی ناں)
اب ہم گزرے دنوں کو اکثر
تنہائی میں سوچ کے بس یہ کہہ دیتے ہیں
کتنے اچھے دن ہوتے تھے
جب ہم خوشبو کے ساتھی تھے

گلنار آفرین

اس روز گرمی اپنے پورے شباب پر تھی' ایسی گرمی کبھی نہیں پڑی کہ شہر کا شہر سنسان نظر آرہا تھا' لوگ مجبوری کی حالت میں ہی گھر سے نکل رہے تھے شہر کی سب سے بڑی مسجد کے سامنے انسانی سروں کا ہجوم بڑا حیران کن تھا' تجسس تھا لوگوں کو کہ آخر کونسی ایسی بات ہو گئی ہے جو مسجد کے سامنے انسانوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے جبکہ گرمی "اف خدا کی پناہ"

ایسا اجتماع تو کبھی سالہا سال سے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ صدیوں سے رہتے خاندانوں نے بھی ایسا انسانی ہجوم مسجد کے سامنے کبھی نہ دیکھ پائے تھے' پھر کیا ہو گیا تھا ایسا؟

مسلمان یوں ایک جگہ تپتی ہوئی سڑک اور جھلسا دینے والے سورج تلے یکجا ہیں۔ بات تو کچھ نہ کچھ ضرور ہے' جو بہت اہم ہے اور یہی جاننے کے لئے بہت سے لوگ اپنی اپنی گردنوں کو اونچا کر کے دیکھنا چاہتے تھے اور بہت سے کانوں سے سننا چاہتے تھے ان آوازوں کو جو مسجد کے بالکل سامنے کھڑے لوگ بول رہے تھے مگر بھیڑ بہت زیادہ تھی!

لوگ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور پھر کچھ دیر کی ہاتھا پائی کے بعد اگلی صفوں والے پیچھے تھے اور پیچھے والے آگے۔ آگے سے پیچھے جو لوگ آئے' اب وہ پیچھے آکر جو بول رہے تھے وہ پچھلی صف والے بھی سن رہے تھے اور معاملہ سمجھ میں آرہا تھا۔

جو لوگ آگے پہنچ گئے تھے ان کے سامنے معاملہ بہت صاف تھا ان کے بالکل سامنے اور مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ایک لاش' سوالیہ انداز میں پڑی تھی۔ اور اس کی آنکھیں بند نہیں تھیں' لوگ کہہ رہے تھے! ان میں سے اکثر نے مرنے والے کی آنکھوں کو بند کرنا چاہا مگر وہ جونہی ہاتھ ہٹاتے ہیں آنکھیں آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔

لوگوں کو حیرت تھی۔

پریشانی تھی۔

لوگ خوفزدہ تھے۔

جتنے بھی لوگ تھے وہاں سب کی زبانوں پر مختلف قسم کی باتیں۔ مختلف قسم کے تبصرے تھے وہ۔ انسان جو سوالیہ انداز سے کولتار کی تپتی سڑک پر اور شہر کی سب سے بڑی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب مرا پڑا تھا وہ ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا' لوگ کہہ رہے تھے۔

یہ کون تھا؟

کہاں سے آیا تھا؟

شیعہ تھا یا سنی؟

وہابی تھا یا بریلوی؟

ہندو تھا' سکھ تھا کہ عیسائی؟

جاسوس تھا کہ غدار؟

"وہ جو بھی تھا' جو بھی ہے ہے تو انسان۔" ایک نوعمر لڑکا شدت جذبات سے چلاتا ہوا بولا۔ "دیکھ رہے ہو تم کہ وہ تپتی ہوئی سڑک پر کس طرح پڑا ہے

اور کیا تم اس کے قریب گئے ہو؟"

"تم نے اسے چھو کر دیکھا ہے؟"

"مذہب، انسانیت، قومیت، نام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" لڑکا، احساس کی آگ میں جلتا ہوا، منہ سے جذبات کے انگارے برساتا، انسانیت کے پھول دامن میں لئے آگے بڑھا اور بڑھتا چلا گیا، وہاں تک جہاں ایک انسان عجیب کربناک انداز میں پڑا ہوا تھا۔

وہ نو عمر لڑکا اس لاش پر یہ کہتا ہوا جھک گیا۔ "تم کوئی بھی ہو، کہیں سے آئے ہو کسی ملک سے تمہارا ناتا ہو۔ کسی مذہب سے واسطہ ہو۔ میرے لئے تو تم صرف ایک انسان ہو، ہماری طرح کے صرف ایک انسان۔"

جب لڑکے نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ اور آنکھوں میں مسرتوں کے چراغ روشن تھے اور اس نے ہاتھ اٹھا کر، مجمع سے کچھ کہنا چاہا اور پھر وہ چلا چلا کر کہنے لگا:

"یہ جسے تم مرا ہوا جان رہے تھے، یہ مرا ہوا نہیں ہے، یہ زندہ ہے زندہ ہے یہ۔ میں نے اس کے سوکھے لبوں پر جنبش دیکھی ہے..... اس کی پلکوں پر لرزش دیکھی ہے، اس کے جسم میں ہلکی ہلکی حرکت دیکھی ہے، اسے فوری مدد کی ضرورت ہے اسے ایک چھت کی ضرورت ہے، اسے پانی کی ضرورت ہے، یہ بیچارہ پردیسی لگتا ہے، اسے یہاں سے اٹھا کر مرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔"

مگر اس لڑکے کا ہاتھ ہوا میں لرزتا رہ گیا، اس کی آواز انسانی شور میں ڈوب کر رہ گئی، کسی نے کچھ جاننا نہیں چاہا اور لڑکے کے سامنے ایک انسان کو زندگی کی آخری رمق تک سے محروم کر دیا گیا۔

لڑکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک انسان کو بے کسی سے مرتا ہوا دیکھتا رہا، اس کی زندگی کا یقیناً یہ پہلا اندوہناک حادثہ تھا، اس پر سکتہ سا ہو گیا اور وہ یوں محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ گمنام انسان نہیں مرا ہے بلکہ وہ خود مر گیا ہے جیسے ساری انسانیت مر گئی ہے، جیسے یہ ساری کائنات مر گئی ہے اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹوٹا اور مرنے والے کے دھوپ سے تپتے گرم چہرے پر گر کر بکھر گیا..... پھر یوں ہوا کہ وہ لڑکا جس کے چہرے پر وحشت سی چھائی ہوئی تھی اور جس کی آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا، وہ اچانک انسانی ہجوم میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور چلانے لگا۔

"تم سب اپنے آپ کو انسان کہتے ہو؟"

"نہیں تم انسان نہیں ہو، درندے ہو، وحشی ہو، قاتل ہو، انسانیت کے، شرافت کے، مذہب کے۔"

"انسان نہیں ہو؟"

"کہاں ہے انسان؟"

"کون ہے انسان؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں بتاتا ہوں۔ وہ دیکھو۔ وہ۔ وہ ہے انسان جو ہمارے سامنے مرا پڑا ہے۔ مر گئی ہے آج انسانیت۔ دفنا دو اسے بے گور و کفن۔ دفنا دو۔ دفنا دو۔ لوگوں نے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ دیوانہ ہو گیا ہے سالا۔

وحشت بیٹھ گئی دل پر۔

آیا تھا بڑا انسانیت بگھارنے۔

مزا آئے گا جب گلی گلی پتھر کھوپڑی پر پڑیں گے۔

سالا۔ سؤر کا بچہ۔ دماغ خراب کر دیا چلا چلا کر۔

لیکن لڑکا بولے جا رہا تھا، بتاؤ، جواب دو۔ دکھاؤ اس انسان کو جو تاریک غاروں سے نکل کر ترقی و کامرانی کے بلند اور روشن میناروں پر پہنچ چکا ہے جو آسمانوں سمندروں اور زمین کی تہوں پر عبور رکھتا ہے، جو تاریخ کے سنگلاخ دور سے ٹکراتا، اندھیروں کو دور کرتا، روشنی میں چلا آیا ہے، کہاں ہے روشنی..... کہاں ہے روشنی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، دکھ بھرا کربناک اندھیرا۔

کوئی زور سے چلایا۔ "دیوانہ ہے دیوانہ۔"

اس کے کان بہت حساس تھے، کچھ دیر پہلے جس نے مرنے والے کی ہلکی سے ہلکی دل کی دھڑکن تک سن لی تھی، وہ لفظ، دیوانہ کیسے نہیں سن لیتا۔

دیوانہ کہنے والے کی آواز بہت بھیانک تھی جس میں تمسخر کے ساتھ ساتھ بے حسی شامل تھی۔

ہاں، میں دیوانہ ہو گیا ہوں، کیونکہ جو کچھ میں نے دیکھا، وہ تم دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے، جو میں نے جانا تم نے جان کر بھی نہیں جانا، اب غور سے سنو۔ "اے عقلمند انسانو کہ میں کسی ایسے اصول، عقیدے، رواج اور مذہب کو نہیں مانتا جس میں انسانیت نہ ہو، محبت نہ ہو۔

کون ہے جو اتنی دیر سے بکواس کر رہا ہے؟

صاحب! یہ پاگل ہے کوئی۔

تو بھگا کیوں نہیں دیتے اسے یہاں سے۔

اور یہ کون ہے؟ کس کی ہے یہ لاش۔ معلوم ہوا کچھ، پولیس کو خبر کی گئی؟ آواز میں حاکمانہ پن تھا تو لہجے سے غرور جھلک رہا تھا، آنکھوں میں طاقت کا نشہ تھا، جسم پر قیمتی لباس تھا اور پاؤں میں شفاف اور قیمتی جوتے۔

"اٹھاؤ، اس لاش کو یہاں سے فوراً۔" فرعون صفت انسان نے ناک چڑھاتے ہوئے انتہائی حقارت و بیزاری سے کہا۔

طاقت کے دیوتا کے ساتھ جو ان گنت چیلے تھے انہوں نے آگے بڑھتے

ہوئے سوال کیا۔

"کہاں پھنکوایا جائے؟"

"پولیس کو فوراً بلواؤ۔ وہ لے جائے جہاں چاہے۔ چاہے وہ سرد خانے میں ڈالے یا ہماری بلا سے جہنم میں لے جائے۔ ہمارا ایریا صاف ہو جانا چاہیے۔

اتنی دیر میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا اور موذن اذان دینے لگا اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے لگا' لیکن وہ لوگ جو کچھ جان لینے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں دھوپ کی تپش سے لاپروا ہو کر کھڑے تھے وہ اللہ کے گھر کی طرف جانے کی بجائے ادھر ادھر ہو کر غائب ہو گئے اور طاقت کا دیوتا بھی اچانک جانے کہاں غائب ہو چکا تھا اور مسجد اس تنہا لاش کی طرح اکیلی رہ گئی جو تپتی دھوپ میں تماشا بنی ہوئی تھی۔ جونہی نماز ختم ہوئی لوگ جانے کہاں کہاں سے نکل کر آنے شروع ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوگوں کے سروں کا ہجوم نظر آنے لگا اور یہ لوگ آپس میں پھر خیالات کا تبادلہ کرنے لگے۔

یہ مرا ہوا انسان اس شہر کا نہیں لگتا۔

"ظاہر ہے بھائی اگر یہاں کا ہوتا تو مسجد کے سامنے کیوں مرتا۔ کسی فٹ پاتھ پر یا گندی گلی میں' یا کسی گھورے پر پڑا ہوتا۔"

"بالکل سچ کہا۔" لوگوں نے تائید کی۔

"لیکن سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا کے گھر کے آگے ہی کیوں مرا۔"

"بھائی ظاہر ہے سو فیصدی یہ مسلمان ہو گا۔" اور پھر لوگوں نے اس بات کو بہت غور سے سنا اور پھر لوگ مرنے والے کی شناخت پر اصرار کرنے لگے ..... آوازوں کے شور میں زور دار گونج تھی۔ اور اسی لمحے وہاں ایک آدمی نمودار ہوا' وہ بھی اپنے چیلوں کے ساتھ ساتھ تھا' اس نے آتے ہی ایک گہری نظر مجمع پر ڈالی اور ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا۔

آپ لوگ مطمئن رہیے' میں آ گیا ہوں' ابھی مرنے والے کی شناخت کروائی جاتی ہے۔ اگر یہ مسلمان ہے تو ہم اسے دفنانے کا بندوبست بھی کریں گے۔" اس نے اپنی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا اور یہ سنتے ہی لوگوں کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑنے لگی اور واہ' واہ ہونے لگی' زندہ باد کے نعرے بھی لگنے لگے' پھر آنے والے نے حکم صادر کیا کہ فوراً چادر کا انتظام کیا جائے۔ اور معتبر ہستیوں کو بھی ساتھ لیا جائے تاکہ وہ تصدیق کر سکیں کہ مرنے والا مسلمان تھا' پھر چادر آئی اور مردے کے ننگے بدن پر ڈال دی گئی اور معتبر ہستیاں کہ جن کے چہروں پر گز گز بڑی داڑھیاں اور ماتھے پر سجدوں کے نشان تھے' وہ لاش کے قریب آئے اور لمبی لمبی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تصدیق کی کہ مرنے والا مسلمان تھا۔

پہلے والا جو واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی جگہ پر اس کا حریف تقریر کر رہا ہے حکم چلا رہا ہے اور لاش کے مذہب کی تصدیق بھی کروا چکا ہے۔ اور تب اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی' تلملا اٹھا وہ۔ غصے سے اور نفرت سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اپنے اندر کھولتے لاوے پر قابو پانے کے لئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست کر لئے تھے' تیوری پر ہزاروں بل اور آنکھوں میں شعلے رقصاں نظر آ رہے تھے' لیکن باطنی جذبے پر قابو پاتے ہوئے اس نے' اپنے حریف کی کارگزاری پر پانی پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے دوستو! یہ مسئلہ بہت اہم' بہت نازک اور انتہائی سنگین ہے آپ لوگ کسی کی باتوں میں ہرگز نہ آئیں' ہر اک کے بس کی بات نہیں ہے' یہ مذہب کا معاملہ ہے اور یہ سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کیونکہ جو ثبوت آپ کو فراہم کیا گیا ہے وہ تسلی بخش نہیں ہے' اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آج دنیا کے اکثر مذاہب میں مسلمانوں جیسی رسم رائج ہے۔ اس لئے یہ یقین کر لینا کہ مرنے والا مسلمان تھا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ان گنت سوالات ہیں ہمارے سامنے!"

"کیا کسی نے اسے قتل کیا ہے..... یا اس نے خودکشی کی ہے؟"

"کیا یہ کسی ملک کا جاسوس تھا؟"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے اسے مارنے میں کوئی سیاسی پارٹی ملوث ہو!"

"اب دیکھئے ہر شخص یہ باریکیاں سمجھ نہیں سکتا' جسے آپ بظاہر بہت معمولی کیس سمجھتے ہیں' غیر اہم معاملہ گردان رہے ہیں' یہ اتنا آسان اور غیر اہم نہیں ہے۔ لیکن ہمیں آتا ہے اسے سنبھال لینا' کیونکہ یہی تو ہمارا کام ہے!"

کچھ لوگوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی بلند آواز سے سوال کیا۔

"مگر آخر کب تک یہ لاش پڑے رہے گی؟"

"اور اس کی آنکھیں بھی بند نہیں ہو رہی ہیں' کہیں کچھ ہونے والا تو نہیں' لوگوں کی خوفزدہ آوازیں گونجنے لگیں!

"آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں' کچھ نہیں ہو گا' کچھ بھی نہیں ہو گا' آپ لوگ اطمینان رکھیں۔" طاقت کے دیوتا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"پوسٹ مارٹم بھی کروایا جائے تاکہ پتہ چل سکے اس کی موت کا سبب" کسی نے کہا تو ایک اور آواز مجمع سے ابھری۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ وقت اتنا لگ جائے کہ لاش سڑنے لگے اور بدبو پھیلنے لگے۔ اک اور آواز نے چلاتے ہوئے کہا۔ "وہ چادر کہاں گئی جو شناخت کے لئے آئی تھی۔ کم از کم وہ اس مردے پر ڈال دی جائے!"

طاقت کے دیوتا نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ بالکل فکر نہ

کریں یہ لاش ابھی اٹھوا دی جائے گی۔" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دوسرا طاقتور جو بہت دیر سے تاؤ کھا رہا تھا غصے سے بھناتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم کبھی نہ مجھ سے پہلے جیت سکے ہو اور نہ آئندہ جیت سکو گے کیونکہ میں تم سے اور تمہاری تمام مکاریوں سے واقف ہوں اور تم سے اچھی طرح نمٹنا بھی مجھے آتا ہے۔"

"تم ٹکر لینا چاہتے ہو؟" دوسرے طاقتور نے تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم انسانیت کے دشمن ہو' قاتل ہو' لٹیرے ہو' ایمان فروش ہو' تمہارے پاس جو دولت کا انبار ہے' جانتا ہوں وہ کیسے اور کیوں ہے' تم اسمگلر ہو اور تمہارے اندر شیطان ہے جو تمہیں ہر لمحہ شیطانیت کی طرف ابھارتا رہتا ہے' تم ملک اور قوم کے غدار ہو۔" یہ لفظ اس نے پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہے۔

پھر دوسری طرف سے بھی اسی قسم کے راز منکشف ہونے لگے اور نوبت گالی گلوچ سے بڑھ کر دھکم دھکا تک اور ہاتھ گریبانوں تک پہنچے اور گریبانوں کی دھجیاں اڑنے لگیں' پھر دونوں طاقت کے دیوتا مع اپنے چیلوں کے گتھم گتھا ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے نفرت' حقارت اور دشمنی کے بھیانک شعلے نکلنے اور منہ سے ڈھیروں جھاگ اڑ اڑ کر ایک دوسرے کے چہروں پر بکھرنے لگے۔ اور منہ سے گز گز بھر کی زبانیں باہر نکل آئیں اور پھر ہر طرف چاقو' چھری' لاٹھی' پتھر چلنے لگے اور چلتے رہے' چلتے رہے' لوگ گرنے لگے زخمی ہو ہو کر' مر مر کر' کٹ کٹ کر اور وہ لاش جو اکیلی تھی پھر یوں اکیلی نہیں رہی۔

موذن جو مسجد کے کسی کونے میں خوف و دہشت سے سہا بیٹھا تھا' اذان دیتے وقت سہا ہوا اٹھا اور نہ چاہنے کے باوجود اپنی ڈیوٹی کی خاطر کرنے سے باہر نکلا اور زمیں سے آسمان تک پھیلتے برستے خون کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا آگے بڑھا۔ اور جونہی اس نے اذان کے لئے اپنا منہ کھولنا چاہا اس کا منہ تازہ تازہ انسانی خون سے اس طرح بھر گیا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جسم مٹی کا ڈھیر ہو گیا۔

انسانی لاشوں کا ڈھیر بڑھتا رہا' نفرت کی آگ سلگتی رہی' پھیلتی رہی' جس کی لپیٹ میں سارا شہر تھا طاقت کے دیوتا جانے کہاں چھپے اپنی اپنی فتح و کامرانی کی دعا مانگ رہے تھے اور سارا شہر نفرت کی آگ میں جل رہا تھا اور انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

آسمان حیران تھا' فرشتے پریشان تھے۔ زمیں پر کہرام برپا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے خدا اور انسان کے بیچ کوئی واسطہ نہیں اور کوئی ایسا وہاں نہیں جو طاقت کے بے رحم دیوتاؤں پر قابو پا سکے۔

ہاں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور وہ لاش تھی کہ جس کی آنکھیں کچھ اور کھل کر پھیل گئی تھیں اور جو ہزاروں لوگوں کا تازہ تازہ خون' شہر کی سب سے بڑی مسجد کے سامنے بہتا دیکھ رہی تھیں!

○

نصف صدی کا قصہ

نذرِ گلزار

صاحبِ سیف و قلم دانشور بریگیڈیئر گلزار احمد کی طویل اور شاندار ملی اور علمی خدمات پر اربابِ تحریر اور اربابِ شمشیر کا ہدیہ ارادت

چند لکھنے والے

○ حکیم محمد سعید ○ ڈاکٹر جمیل جالبی ○ پروفیسر پریشان خٹک ○ جنرل مرزا اسلم بیگ ○ جنرل فیض الرحمن ○ جسٹس عبد الجبار ○ الطاف حسن قریشی ○ سید ضمیر جعفری

رابطہ = الگلزار 4 گلستان کالونی راولپنڈی

افسانہ
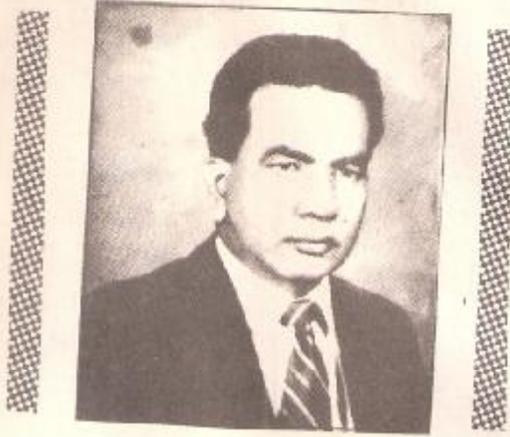
گاما، بھیمو اور بے بے

ڈاکٹر احسان احمد شیخ

گرمیوں کی شام، فضا دھول سے اٹی ہوئی تھی، سورج سارا دن لال پیلا رہنے کے بعد تھک ہار کر سردیوں کے سنگترے کی طرح ہو کر آہستہ آہستہ افق پر جمع ہونے والی گرد میں تحلیل ہو رہا تھا۔ گاما نہر کی پٹی سے اتر کر ساتھ لگے گنوں کے کھیت کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا دور دور تک کوئی اور نہیں تھا کھیت کے ساتھ جب گاما سیدھے ہاتھ پگڈنڈی پر مڑا تو اچانک سامنے سے بھیمو آتی نظر پڑی بھیمو اسی وقت گھر کے باہر؟ گاما حیران تھا۔ بھیمو نے بھی گاما کو دیکھ لیا، مسکرائی اور گنے کے کھیت کے اندر چلی گئی۔

یہ بھیمو کھیت میں کیا کر رہی ہے؟

گامے کا دماغ خراب ہو گیا، جیسے سر میں بیچے کی طرح کسی نے اینٹ رکھ دی ہو، وہ بھی گرم گرم لال بھبو کا اینٹ جس کی گرمی اس کے کانوں اور ناک کے نتھنوں سے باہر آنے لگی جسم کی کھال پھولنے لگی جیسے بے بے تنور میں روٹیاں پکائے تو آٹا پھول کر بیلنے سے بڑا ہوتا ہے گاما بھی کھیت کے اندر چلا گیا۔

بھیمو نے اسے دیکھا تو ہنسنا شروع کر دیا اتنا ہنسی کہ دوہری ہو گئی سر سے دوپٹہ اتر کر پیروں میں آن گرا، شام کا اندھیرا رات کی سیاہی میں بدل گیا اور آس پاس لگے گنے کے پودے لمبے ہوتے ہوتے آپس میں جڑ کر دیواریں بن گئے جن میں گاما اور بھیمو قید ہو گئے۔ ستارے گے اور بھیمو ہر چیز سے بے نیاز ہنستی ہی جا رہی تھی اور ہنستے ہنستے اس نے اپنا سر گاما کے سینے پر رکھ دیا گاما نے گھبرا کر نظریں نیچے کی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے اور بھیمو کے درمیان لسی سے بھری ہوئی دو گڈوی اٹکی ہوئی ہیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گڈویاں الٹ گئیں اور ساری لسی گاما کے کپڑوں پر آن گری۔

اور گاما کی آنکھ کھل گئی۔

گاما نے گھبرا کر سب سے پہلے تو بے بے کے پلنگ کی طرف دیکھا اندھیرے میں صرف برآمدے میں فرش پر رکھی لالٹین کی نیچی کی ہوئی بتی سے اتنی روشنی نکل رہی تھی جس میں بے بے کا ہلکا سا ہیولہ نظر آ رہا تھا بے بے نے دوسری طرف کروٹ لی ہوئی تھی اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی گاما نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کی چوری پکڑی نہیں گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی ٹانگوں پر ہاتھ پھیرا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو جیسے وہ ایک دم کمزور، بوڑھا سا ہو گیا ہو، یہ خیال اتنا احمقانہ تھا کہ گاما نے فوراً ہی اسے دماغ سے نکال دیا اور بے بے کی طرف سے منہ پھیر کر لیٹ گیا یوں بھی اسے بہت زور کی نیند آ رہی تھی۔

صبح بے بے نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا تو اس نے گھبرا کر چادر اپنے اوپر کر لی اور پھر بھاگ کر اندر کمرے میں آ گیا۔ اس گھر میں ایک ہی کمرہ تھا جس میں

ایک طرف لکڑی کا تخت بچھا تھا جس پر کوئی خاص مہمان آئے تو چادر بچھا کر کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سامنے کی دیوار پر تین لمبے لمبے تختے لگے تھے جن پر چینی کے برتن اور شیشے کے گلاس رکھے تھے گامے کو یاد تھا پہلے یہ برتن مٹی کے اور پلاسٹک کے ہوتے تھے مگر جب سے اس کا بڑا بھائی دیمو دبئی گیا تھا یہ برتن بھی تبدیل ہو گئے تھے دیمو پچھلے سال آیا تو ایک بڑا ٹیپ ریکارڈر اور ریڈیو بھی لایا تھا جس پر سرخ کپڑا ڈال کر بے بے نے اسے بھی برتنوں کے بیچ سجا دیا تھا اور گامے کو اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی۔ دیمو اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا کیمرہ بھی لایا تھا جس سے اس نے گامے اور بے بے کی تصویریں اتاریں تھیں پھر شہر جا کر اس نے یہ تصویریں صاف کرائیں گامے کی تصویر تو اسے دے دی اور بے بے کی تصویر بڑی کرائی ایک تصویر اپنے ساتھ دبئی لے گیا اور دوسری تصویر فریم میں لگا کر برتنوں والے تختے پر رکھ گیا شیشے کے ساتھ گاما روز صبح اٹھ کر شیشہ دیکھتا اور کنگھی کرتا تھا اور روز اس کی نظر بے بے کی تصویر پر پڑتی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ اس دن دیمو اور گامے نے بے بے کو بہت تنگ کیا تھا وہ تصویر اترواتے ہوئے اتنا شرما رہی تھی جیسے نئی نویلی دلہن ہو۔ آخر کار بڑی مشکل سے وہ تصویر بنوانے پر راضی ہوئی۔ سفید چادر خوب اچھی طرح سر اور چہرے کے گرد لپیٹ کر وہ کرسی پر بیٹھی تو دیمو نے تصویر اتاری۔ روز صبح گاما یہ تصویر دیکھتا تو اسے لگتا جیسے بے بے اس کی ماں نہیں آسمان سے اترا فرشتہ ہے جس کے چہرے کے اردگرد روشنی کا ہیولہ ہے۔ نیکی اور پاکیزگی کی روشنی ہے جو بے بے کی پیشانی سے نکل کر تصویر کے فریم سے باہر پھیل رہی ہے۔

گاما روز صبح اٹھ کر اور پھر دن میں کئی بار شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کرنے کے بہانے اپنے چہرے کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتا۔ اس کے ہونٹ جو پہلے گلابی تھے اب آہستہ آہستہ ہلکے سے سیاہی مائل ہو رہے تھے اس کے ہونٹوں اور ناک کے درمیان کالے سے ریشوں کی تہہ سی جم رہی تھی جس پر ہاتھ پھیر کر اسے بڑا مزا آتا تھا۔ دونوں کانوں کے سامنے بھی گالوں پر اسی طرح کے روئیں اگ رہے تھے۔ گامے کو اپنی عمر تو پتہ نہیں تھی مگر یہ معلوم تھا کہ وہ دیمو سے پورے چھ سال چھوٹا تھا۔ دیمو نے تو دسویں بھی پاس نہیں کی اور دبئی چلا گیا مگر گاما اب خیر سے نویں میں پڑھ رہا تھا اور اس کا پکا ارادہ تھا کہ دسویں تو پاس کر کے رہے گا یوں بھی گاؤں میں دسویں سے آگے کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج کل گامے کو اپنی پڑھائی کی نہیں بلکہ اپنے سراپے کی بڑی فکر تھی وہ ایک دم بے ہنگم طریقے سے لمبا ہو گیا تھا پچھلے سال دیمو نے جو شلوار قمیض کا سوٹ اسے دیا تھا وہ تو لگتا تھا بالکل ہی چھوٹا ہو گیا ہے وہ بات کرتا تو گلے سے عجیب بے ہنگم آواز نکلتی بھی پتلی بھی موٹی۔ پھر یہ الٹے سیدھے خواب اسے اور پریشان کرتے۔ اس نے نائی کی دکان پر لوگوں کو اکثر عجیب و غریب بیماریوں کی باتیں کرتے سنا تھا اور کبھی کبھی اسے یقین سا ہونے لگتا کہ یقیناً اسے کوئی بیماری لگ گئی ہے۔ گھر میں اور کوئی تھا بھی نہیں جس سے وہ پوچھے۔ ابے کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ دیمو دبئی چلا گیا۔ ایک کے بے بے تھی اور یا پھر جھیمو۔ خالہ رسولن کی بیٹی جو ماں کے مرنے کے بعد نانا نانی کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ تھی بھی گامے کے عمر کی اور بچپن سے گامے کے ساتھ کی کھیلی ہوئی مگر اب وہ بھی گامے کے گھر کم آتی تھی۔ اس دن بے بے جھیمو کی نانی کو کہہ بھی رہی تھی کہ جھیمو اب بہت بڑی ہو گئی ہے حالانکہ جھیمو گامے سے کم از کم تین انگل تو چھوٹی ہوگی۔

گامے کو جھیمو بہت ہی اچھی لگتی تھی وہ جب بھی پہلوان کے چھپر میں ایک روپیہ دے کر اور بے بے سے چوری چوری ہندوستانی فلم وی سی آر پر دیکھتا تو اسے ہر ہیروئن جھیمو جیسی نظر آتی اس کا دل کرتا وہ بھی جھیمو۔ ایسی ہی باتیں کرے جیسے فلم کا ہیرو ہیروئن کے ساتھ کرتا تھا مگر اول تو گا اتنی مشکل باتیں کرنا ہی نہیں آتی تھیں دوسرے جھیمو اب اس کے آتی تھی آتی بھی تو بے بے کے ساتھ جڑ کر بیٹھی رہتی۔ گاما یوں ہی کے صحن میں آتا جاتا رہتا ہاں کبھی کبھی جھیمو اسے چوری۔ اسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو مگر بے بے کی وجہ سے کہہ نہیں پا رسولن کے گھر نیاز کے چاول لے کر گیا دروازے پر پلیٹ لے کر آہستہ سے بولی۔

غلام محمدے میں نے تجھ سے کچھ بات کرنی۔

گامے کو پہلی خوشی تو یہ ہوئی کہ سارا گاؤں اسے اسے اس کے اصلی نام سے پکارا۔ وہ وہیں، کھڑا ہو گیا کیونکہ اندر کمرے سے جھیمو جھیمو خالی پلیٹ لے کر دروازے پر پہنچی تو آواز لگائی جھیمو الٹے پاؤں اندر چلی گئی مگر نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ غلام محمد۔ وہ ایک دن کہوں گی ضرور

"گامے تو اندر کیا کر رہا ہے باہر آ دودھ پی۔ بے بے کی آواز نے گامے کے خیالات خاموشی سے ٹرنک پر پڑا تولیہ اور صابن ا گلاس لے لیا۔ سفید دودھ کا گلاس دیکھ خراب ہونے لگا اس نے دودھ کا گلاس۔

تو دودھ کیوں نہیں پیتا؟ تیرا جی تو اچھا ہے"
بے بے فکر مند ہو گئی۔
"بے بے غسل کرکے پی لوں گا۔ نہر پر جا رہا ہوں"
کیا بات ہے گامے۔ آج کل تو بڑا صفائی پسند ہو گیا ہے" بے بے نے پیچھے سے آواز لگائی ایک لمحے کو گامے کے اٹھتے قدم رک سے گئے اسے محسوس ہوا بے بے نے اس کی چوری پکڑلی ہے۔ اسے یاد آیا اسکول میں استاد جی نے ایک بار کہا تھا خدا کے بعد اگر کسی کو کسی انسان کے دل کا بھید پتہ ہوتا ہے تو وہ ماں ہوتی ہے۔ جس کو اس کے بچے کی ہر بات بغیر کہے سمجھ آجاتی ہے۔ گامے کو اور کچھ تو نہیں سوجھا جلدی سے گھر کا دروزاہ بند کرکے باہر نکل گیا۔

جب وہ نہر سے نہا کر باہر آیا تو خوب روشنی پھیل چکی تھی۔ نہر کی پٹی پر اکا دکا بیل گاڑیاں آجا رہی تھیں ان کے اڑنے والی گرد سے بچنے کیلئے گاما نہر کی پٹی سے نیچے اتر کر کھیت کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سے جھیمو آ رہی تھی اس کے ساتھ اس کی سہیلی زرینہ تھی۔ گامے کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے اس نے رک کر چاروں طرف دیکھا دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور سامنے سے جھیمو اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ گامے کے ہاتھوں میں ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے اچھل کر کھیت میں جا گرے گا۔ اچانک زرینہ رک گئی اور ہنسنے لگی جھیمو نے اسے پیار سے ایک چپت لگائی اور آہستہ آہستہ گامے کی طرف بڑھتی آئی دھرتی نے گامے کے قدم پکڑ لئے۔

"غلام محمدے۔ میں نے تجھ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے"
گامے کو لگا جیسے جھیمو کی آواز کسی کنویں سے آرہی ہے
"کیا بات ہے؟ گامے نے بڑی مشکل سے کہا اور بات کرتے ہی شرمندہ سا ہو گیا اس کے حلق سے عجیب موٹی سی آواز نکلی تھی۔
"تو آج گیا تھا ویرو کل رات چھٹی آ رہا ہے نا" جھیمو نے انگلی پر دوپٹہ لپیٹتے ہوئے پوچھا گامے نے دیکھا اس کے ہونٹوں سے اوپر پسینے کی بوندیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے گامے کے ہاتھ میں پسینہ آرہا تھا۔
"ہاں۔ کل رات کسی وقت پہنچے گا" گامے نے جواب دیا۔ اسے خوشی تھی کہ کسی طرح بات چیت تو شروع ہوئی۔
"غلام محمدے یہ بات کسی اور کو نہ بتانا۔ ویرو سے کہنا مجھے کل رات ہی کرماں والے باغ میں ملے۔ جھیمو کی آواز ایسے کانپ رہی تھی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔
گامے کو لگا جیسے اس کے پیٹ سے ایک گولہ اوپر کو اٹھا اور اس کے گلے کے بیچوں بیچ جا کر اٹک گیا۔ اس نے سانس لینے کے لئے منہ کھولا تو کھلا ہی رہ گیا۔ دل جو زور زور سے دھڑک رہا تھا اچانک رک رک کر چلنے لگا جیسے اسٹیشن نزدیک آنے پر ریل گاڑی کی چھکا چھک کی آواز آہستہ آہستہ چھک.... چھک.... میں بدل جاتی ہے۔
"غلام محمدے تو سن رہا ہے نا"
جھیمو کی آواز سن کر گامے کا کھلا منہ بند ہو گیا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ جھیمو سے کیا کہے۔
"مگر کرماں والا باغ تو بہت بڑا ہے ویرو تجھ کہاں ملے گا؟"
گامے کو سمجھ نہیں آئی اس نے جھیمو سے یہ بات کیوں پوچھی۔
جھیمو کا چہرہ یوں سرخ ہوا کہ جیسے سرخی کانوں سے خون بن کر ٹپکنے لگے گی۔ اس کے ہونٹ ایسے کپکپانے لگے جیسے ابھی چہرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اس نے زمین پر پیر کے انگوٹھے سے لکیریں بناتے ہوئے گامے کی طرف آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر دھیرے سے کہا۔
"وہ.....وہ.....ویرو کو جگہ کا پتہ ہے"
یہ کہتے ہی جھیمو کھسیانی سی ہنسی ہنس کر تیزی سے واپس جانے کیلئے مڑی تو اس کا دوپٹہ ڈھلک کر زمین پہ آگرا بالکل ایسے ہی جسے رات گامے نے خواب میں دیکھا تھا مگر اب گامے کو لسی بھری کوئی گڈوی دکھائی نہیں دی۔ جب جھیمو نے دوپٹہ اٹھا کر سر پر رکھا اور چہرے کے آس پاس لپیٹا تو گامے کو بے بے کی تختے پر رکھی تصویر یاد آگئی

صاف صاف
اجلی اجلی
فرشتے کی طرح

نئے لہجے کی توانا اور منفرد آواز
اختر ہوشیار پوری
کا تازہ مجموعہ غزل
سمت نما
صفحات 168 قیمت =/99 روپے
سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور

خاکہ

سائنس و ادب کا نباض

عابد معز

شہر ریاض کی ایک جمعراتی ادبی محفل میں ایک چھریرے بدن کے طویل قامت شخص کو مسند صدارت پر جلوہ افروز دیکھ کر میں سوچ میں ڈوب گیا۔ آس پاس نظریں دوڑائیں تو مستقل صدر نظر نہ آئے مجھے یہ بات واضح کر دینی چاہیئے کہ ریاض کی محفلوں کے نہ صرف صدر اور کنو ینرز مستقل ہوتے ہیں بلکہ شرکاء اور سامعین بھی دی گنے چنے لوگ ہوتے ہیں جو ہر محفل میں منجمد رہتے ہیں۔ قیاس ہوا کہ مستقل صدر خروج نمائی پر وطن سدھارے ہوں گے اور موصوف نے ان کی جگہ پر کی ہے۔ دوسری جمعرات کو میرا اندازہ پچاس فیصد سچ ثابت ہوا محفل میں مستقل صدر کو گرمجوشی سے وداع کیا گیا اور ایک نئے مستقل صدر کا اعلان ہوا۔ پچھلی محفل کے صدر سامعین کے درمیان بیٹھے نظر آئے تو میں نے انہیں جی بھر کر دیکھا۔ گندمی رنگ، اونچی پیشانی، کھڑی ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور چہرے سے ذہانت اور بشاشت برس رہی ہے۔ نام دریافت کیا تو پتہ چلا کہ من موہنی شخصیت کا نام ڈاکٹر انور نسیم ہے۔ نام میں ڈاکٹر کی اضافت سن کر اپنائیت اور قربت کا احساس ہونے لگا۔ خوش ہونے سے قبل میں نے مطمئن ہونا چاہا کہ کیا ڈاکٹر انور نسیم ادب کے ڈاکٹر تو نہیں ہیں۔ جواب، میری خوشی میں مزید اضافہ کا باعث بنا۔ انور نسیم تحقیقی ڈاکٹر اور ایک مشہور اور نامور سائنسدان ہیں۔

میں اور شجاع الدین غوری صاحب بغل میں شگوفہ دبائے ڈاکٹر انور نسیم کو شگوفہ جال میں پھانسنے پہنچے تو ہماری باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ اردو زبان سے بے توجہی اور ادبی رسالوں کی کسمپرسی پر ہم نے متفقہ طور پر پہلے اظہار افسوس کیا اور پھر کف افسوس ملا۔ دیگر رسمی باتوں کے درمیان ڈاکٹر انور نسیم نے اردو کی ترقی کے لئے سائنسی طریقہ کار اپنانے اور باہمی تعاون اور ربط و ضبط کے خیال کو پیش کیا تو شجاع الدین غوری صاحب نے لبیک کہا اور میں نے ان حضرات کی صحبت کو اپنے لئے ایک اعزاز جانا۔ یوں ہماری ملاقاتیں اور تعلقات شگوفہ اور قابت (فروغ اردو کی بین الاقوامی تنظیم) کے حوالے سے مستحکم ہونے لگے۔

ہماری ملاقاتوں میں موضوع سخن زیادہ تر زبان اور ادب ہوتا ہے۔

قابت سے فرصت ملی تو کبھی فیض فاؤنڈیشن، کنیڈا کے قیام کی روداد تو کبھی ادارۂ شگوفہ کی کہانی ہے۔ کسی وقت ضمیر جعفری صاحب قبلہ، ولی عالم شاہین صاحب اور دیگر اکابرین کی صحبتوں کا ذکر ہے تو کسی ملاقات میں کتابوں اور رسالوں پر تبصرے شامل ہیں۔ موقع نہ ملا کہ کبھی پروفیشنل زندگی کے تعلق سے گفتگو کی جائے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے قبل میں نے ایک ملاقات میں ڈاکٹر انور نسیم سے اس ضمن میں پوچھ ہی لیا۔ محسوس ہوا کہ وہ اپنے بارے میں باتیں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ کریدنے پر انہوں نے ہچکچاتے ہوئے بتلایا کہ علم جینیات (genetics) پر ایک کتاب لکھی اور چار کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ ایک کتاب کا ترجمہ جاپانی زبان میں ہوا ہے۔ ایک سو سے زائد تحقیقاتی مقالے مختلف سائنسی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ مزید تفصیلات یہ کہہ کر ٹال گئے کہ خود اپنے بارے میں کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔ میں نے کتابیں دیکھنے کی خواہش کی تو کہا "کہیں رکھی ہوئی ہیں۔ آئندہ کبھی بتلاؤں گا۔" اصرار کرنے پر مسکراتے ہوئے اٹھے جیسے پوچھ رہے ہوں "آپ یقین کرنا چاہتے ہیں" اور اپنی کتابیں لے آئے بہترین کاغذ پر شاندار چھپی کتابیں کافی وزنی تھیں۔ ادھر ادھر سے سرسری ورق گردانی کی۔ کچھ پلے نہ پڑا۔ واپس کرتے ہوئے میں نے کہا "بہت اچھی کتابیں ہیں۔ لوگوں اور سائنس کا بہت بھلا ہوا ہوگا۔" ڈاکٹر انور نسیم نے نظریں جھکائے لقمہ دیا "میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں سوچنے لگا کہ یہ شخص اتنے عرصے سے اردو ادیبوں کے ساتھ رہ رہا ہے بلکہ خود نے لکھا بھی

لیکن ماحول کا ا ثر نہ ہوا - بقول شخصے کتاب چھپتے ہی ادیب کتاب
ے بلکہ گلے میں لٹکائے ہر و قت گھومتے ہیں اور احباب سے خریدنے
لئے اصرار کر تے ہیں۔ نئی نسل نہ ادبی کتابوں کی نکاسی کا یہ ایک طریقہ
ی ہے۔ اس موقع پر جناب ضمیر جعفری صاحب کا ڈاکٹر انور نسیم کے
ق سے کہا ہوا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ "علمی امتیازات سے اس قدر لدا
ہوا شخص کس قدر منکسر ہے۔"

سائنسدانوں کی اکثریت اپنے خول اور ذہن میں بند رہتی ہے۔ تنہائی ان کا مقدر اور غائب دماغی نشان امتیاز بن جاتی ہے لیکن ڈاکٹر انور نسیم میں سائنسدانوں کی ایسی کوئی صفت نہیں پائی جاتی۔ کبھی ان کو دوستوں کے نام بھولتے نہیں دیکھا۔ ان کی یادداشت کے تعلق سے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ انہیں ماضی کے ایک شاعر کی اکلوتی غزل بھی یاد ہے۔ ڈاکٹر انور نسیم سائنس کی گتھیوں میں الجھے رہنے کے باوجود دنیا کے حالات پر نظر اور اپنے ماحول سے واقفیت اور مطابقت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی وصف انہیں دانشوروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایک مرتبہ گہری فکر میں ڈوبے ہوئے کہنے لگے "سمجھ میں نہیں آتا آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بوسنیا میں نسل کشی' ہندستان میں فسادات' افغان میں آپسی لڑائی ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔" کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر کہا "لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔" آج کے حالات کا المیہ شاید یہی ہے کہ دانشور بے بس و لاچار ہے۔

ڈاکٹر انور نسیم نے ادب' ادیبوں اور شاعروں کو بہت پڑھا ہے۔ انہیں گھر میں اطمینان سے بیٹھ کر پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ ایک مرتبہ میں نے فون کیا۔ علیک سلیک کے بعد رسماً دریافت کیا۔ "کیا آپ مصروف تھے۔" جواب ملا۔ "نہیں' خاص مصروف تو نہیں تھا میں اختر الایمان کو پڑھ رہا تھا۔" دوسری مرتبہ سوال دہرانے پر انہوں نے بتلایا "ناروے سے بازگشت کا نیا شمارہ آیا ہے۔ ورق گردانی کر رہا تھا۔" تیسری مرتبہ ڈاکٹر انور نسیم نے کہا "مختار مسعود کی کتاب (سفر نصیب) پڑھ رہا تھا۔ کیا آپ نے پڑھی ہے۔" اس کے بعد سے میں نے ڈاکٹر انور نسیم سے پوچھنا بند کر دیا کہ کیا آپ مصروف تھے۔ قیاس کر لیتا ہوں کہ وہ یقیناً مطالعہ میں غرق تھے ہوں گے۔ کبھی اس قسم کے جواب کی امید سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے کہ "آپ کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ کیا آپ نے اسے لکھنے کے بعد اور اشاعت کے لئے بھیجنے سے پہلے دیکھ لیا تھا۔"

ڈاکٹر انور نسیم نے افسانے لکھے ہیں لیکن اتنے نہیں کہ انہیں ادیب کہا جائے کم لکھنے پر کم از کم مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ادب کا اچھا ذوق' مطالعہ کا شوق اور پھر برصغیر سے باہر کینیڈا میں رہتے ہیں۔ حالات سازگار ہیں کہ خوب لکھیں بلکہ شاعری بھی کریں ڈاکٹر انور نسیم کا حق بنتا ہے۔ معلوم نہیں جناب نے اپنے حق کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ وجوہات دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ میں نے دو ایک افسانے پڑھے ہیں۔ مجھے پسند آئے اور محسوس ہوا کہ ڈاکٹر انور نسیم نے انہیں انتقاماً لکھا ہے ان لکھاریوں سے انتقام' جو شاید اپنا ہر دن افسانہ سے شروع کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر انور نسیم نے شعر نہیں کہا ہوگا اور نہ کہنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ میں نے انہیں اچھے اشعار پر جی کھول کر داد دیتے ہوئے دیکھنے کے ساتھ ہر وقت کی "عرض کیا ہے" سے گھبراتے ہوئے بھی پایا ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے۔ "لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اپنے اوپر اور دوسروں پر بھی۔ کل رات کھانے پر بعد اصرار اس شرط پر گیا کہ صرف کھانا ہوگا۔ مشاعرہ نہیں۔ لیکن کھانے کے بعد چائے پیش کرتے ہوئے دروازے بند کر دیئے گئے اور ایک صاحب نے غیر رسمی مشاعرہ کا اعلان کر دیا۔ مرغن غذا ہضم ہونے تک مشاعرہ چلتا رہا۔ بھاگنے کا موقع تھا اور نہ سونے کا' اونگھتے ہی شاعر توجہ کا طلبگار ہوا چاہتا تھا۔"

ڈاکٹر انور نسیم وطن ثانی کینیڈا میں ادبی تقریبات منعقد کرنے کا شاندار ریکارڈ رکھتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو بلانا' انہیں ٹھہرانا اور ان کی ناز برداری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ماضی میں بادشاہ اور خان بہادر ہی ہمت کیا کرتے تھے۔ اب وہ لوگ رہے نہیں۔ ڈاکٹر انور نسیم نے کئی مرتبہ اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ادب کا صاف ستھرا ذوق' مطالعہ کا شوق اور ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی کا حوصلہ اگر کسی میں ہو تو میرے خیال میں وہ ادب کا سچا خادم ہے اور فروغ ادب میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

ادب اور سائنس دو مختلف اور متضاد میدان ہیں۔ ادب میں دل کی اہمیت اور جذبات کی حکمرانی ہے تو سائنس میں عقل و فہم سے واسطہ پڑتا ہے اور دانائی پرکھی جاتی ہے۔ سائنسداں ہجر اور وصل کا مزہ چکھے بغیر زندگی کی سچی مسرت سے محروم رہتے ہیں تو ادیبوں اور شاعروں کو سائنس تو دور معمولی ایک اور ایک' دو والی گفتگو تک پلے نہیں پڑتی۔ ان کے نزدیک ایک اور ایک کبھی صفر' کبھی گیارہ تو کبھی ایک بڑی طاقت ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو گیارہ بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انور نسیم کا کمال ہے کہ وہ ان میدانوں میں کامیاب و کامراں ہیں۔ دل و دماغ میں تعاون برقرار رکھا ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے ایک دوست کی بات یاد آتی ہے کہ تحقیق کار بنتے یا بنائے نہیں جاتے بلکہ شاعر اور ادیب کی طرح پیدائشی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر مسرور زیدی

صبح کو ڈاکٹر صاحب نے آکر جگایا تو ہم جاگے۔ رات کی بات رات کے ساتھ گئی۔ صبح ناشتے پر خانہ اور اہل خانہ سے مزید گھلنے ملنے پر معلوم ہوا کہ ہمہ خانہ آفتاب تھا۔ ڈاکٹر زیدی ایک ماہر ڈاکٹر ہی نہیں، ایک ماہر "پائلٹ" بھی ہیں۔ اپنا ذاتی ہوائی جہاز خود اڑاتے ہیں۔ جس میں اب تک دو مرتبہ بحر اوقیانوس پار کر چکے ہیں۔ ہاتھ میں مریضوں کے لئے شفا کی طرح "مکانوں" کے لئے بھی "شفا" رکھتے ہیں۔ یعنی ہماری (ARCITECTURE) فن کے بھی مسلم الثبوت شناور مانے جاتے ہیں۔ اب تو خیر مریضوں سے اتنی مہلت بھی نہیں ملتی کہ خود اپنے مکان میں بھی رہ سکیں۔ لیکن جن دنوں "آرکی ٹیکچر" کے لئے کچھ وقت نکال سکتے تھے، مکانات بنوانے والوں کی لمبی لمبی قطاریں ان کے مکان پر لگی رہتی تھیں۔ ان کا اپنا مکان ان کے کمال فن کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ مثلاً یہ کہ باہر سے ایک منزلہ مگر اندر سے تین منزلہ ہے۔ یہ گھر شہر سے باہر ایک جھیل کے کنارے پر واقع ہے۔ برآمدے میں سے جھیل کی طرف ایک قدم بڑھاؤ تو جھیل "اپنی مرغابیوں سمیت" دو قدم آگے آکر آپ سے آملتی ہے ------ ڈاکٹر صاحب نے "الف" سے لے کر "ی" تک ساری تعلیم انگریزی میں پائی۔ مدرسے میں اردو نہیں پڑھی۔ مگر گھر پر میرزا غالب اور شفیق الرحمٰن پڑھ رکھا ہے۔ دیوان غالب کے جتنے نسخے آج تک جہاں جہاں سے نکلے ہیں، ان کے پاس موجود تھے۔ اسی طرح شفیق الرحمٰن کی "حماقتیں" اور "مزید حماقتیں" بھی۔ غالب سے تو ان کو عشق ہے۔ گھر میں ایک کمرے کو "ایوان غالب" (بلکہ دیوان غالب) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ کمرہ اتنا کشادہ ہے کہ اس میں چاندنی کے فرش پر سو ڈیڑھ سو آدمی فروکش ہو سکتے ہیں۔ "ایوان غالب" کے نسخوں اور دیواروں پر ان کے مختلف زاویوں کی "پورٹریٹ" تصویروں کے علاوہ میرزا کی چہار گوشہ ترکمانی یا ڑھ کی ٹوپی اور چغہ وغیرہ بھی الماریوں میں چنے رکھے ہیں ----- چوں قبیلہ گرد لیلیٰ۔ معلوم ہوا کہ اس "دیوان خانے" میں سال کے سال -----

"یوم غالب" کی تقریب پر ------ میرزا غالب "کھیلا" بھی جاتا ہے۔ تمثیل میں میرزا کا کردار خود ڈاکٹر زیدی ادا کرتے ہیں۔ "البم" کی تصویروں میں ڈاکٹر صاحب کو میرزا غالب کے روپ (یا بہروپ) میں دیکھ کر دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کو چھپاؤ میرزا غالب کو نکالو۔ امریکہ میں ڈاکٹر زیدی بحیثیت غالب بھی اتنے مقبول ہیں جتنے "بحیثیت ڈاکٹر" وہ تو انہوں نے اپنے معمولات پر کمال ضبط حاصل کر رکھا ہے ورنہ کچھ عجب نہ تھا کہ میرزا غالب ------ ڈاکٹر زیدی پر مکمل طور پر غالب آجاتے۔ اور لوگ ان کے پاس اپنا ہاتھ دکھانے کے بجائے' میرزا غالب کا ہاتھ دیکھنے آتے۔

نظم میں میرزا غالب کے بعد صرف غلام ربانی تاباں سے سروکار رکھتے ہیں۔ اور نثر میں صرف مزاح نگاروں سے واسطہ ہے۔ وہ بھی شفیق الرحمن' کرنل محمد خان اور مشتاق احمد یوسفی سے۔ شفیق الرحمن تو ان کو اس قدر زبانی یاد ہے کہ وہ "شفیق الرحمن میں" پہروں گفتگو کر سکتے ہیں۔ بچوں کی تربیت ان کے "شگوفوں" کے ذریعے ہو رہی ہے۔ کھونٹی پر ایک "برساتی" ان کے نام کی ٹانگ رکھی ہے۔ کیا عجب کہ "خسوں" میں بھی "شفیق الرحمن لکھ" جاتے ہوں۔ اتنا "شفیق الرحمن" ہم نے 26 راولپنڈی ویسٹرج 1 میں بھی نہیں دیکھا' جہاں شفیق الرحمن خود رہتے ہیں۔ جب ہم نے ان کو بتایا کہ ہم تو راولپنڈی میں گزشتہ پندرہ برس سے ہر جمعے کے جمعے کرنل محمد خان کے ہاں اکٹھے ہوتے ہیں' تو ان کی آنکھوں میں اس حقیر لقیر کے لئے ارادت و عقیدت کی ایک ایسی چمک کوندنے لگی کہ میں عرق ندامت میں ڈوبنے لگا۔ ہمارے قیام کے زمانہ میں وہ بارہا اپنی اس دلی خواہش کا تذکرہ کرتے رہے کہ اے کاش کبھی شفیق صاحب یہاں کچھ عرصہ ان کے ہاں قیام کر سکیں۔ اس خواہش کے اظہار میں ڈاکٹر صاحب کی شیفتگی کی لاگ اور لگن کچھ اس شدت کی ہوتی کہ گویا شفیق الرحمن کے بغیر ان کا ہوائی جہاز ------ ان کی جھیل ------ جھیل پر بندھی ہوئی سفائی کشتی اور اڑتی ہوئی مرغابیاں ------ ہر چیز بے مصرف و بے کار تھی۔

بھابی (مسز زیدی) نے بھی اگرچہ کئی اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں سمیٹ رکھی ہیں۔ مگر یہاں صرف گھر ہی سنبھال رکھا ہے۔ جو ظاہر ہے اتنا بڑا تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلے۔ مشین کے پیچھے آخر انسان کو بھی تو ہونا چاہئے۔ بھابی جیسا کہ ہم نے بعد میں دیکھا' صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں بھی انتظامی امور کی نگرانی کرتی ہیں۔

فرحت منظور نے اردو سمیت تین مضامین میں "ایم اے" کر رکھا تھا۔ یوں اردو ادب سے ان کی دلچسپی سے لگتا تھا کہ تینوں "ڈگریوں" میں سے صرف اردو کے "ایم اے" ہی کی ڈگری "زندہ" تھی۔ اور زندہ بھی اس توانائی کے ساتھ کہ اردو زبان کے ارتقائی سفر کا ایک ایک سایہ اس بی بی کی نگاہ میں تھا۔ اکثر اساتذہ سخن کا بیش تر سرمایہ سخن (محاسن و معائب سخن کے سمیت) نوک زبان پر تھا۔ محشر صاحب کے آنے سے پہلے ان کے اشعار سناتی رہیں۔ لیکن اچنبھا تو ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے عبدالعزیز خالد کے اشعار بھی ان کی زبانی سن لئے۔ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے لے کر لاہور تک کی عصری شاعری سے بھی وہ باخبر تھیں۔ ہم لوگ اکثر حیرت سے سوچا کرتے کہ یہ خاتون' جو ساری اردو شاعری کو گھول کر پئے بیٹھی ہے خود شعر کیوں نہیں کہتیں۔

کرنل ظہور اختر

صبح سویرے اٹھتے ہی ہم نے نائلہ بچی کو ٹیلی فون کیا۔ نہ صرف نائلہ مل گئی بلکہ حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ محبی کرنل راجہ سلطان ظہور اختر صاحب بھی مل گئے۔ پتا چلا کہ وہ ہمارے پیچھے پیچھے ہی یہاں آ گئے تھے۔ اور گزشتہ دو مہینے سے "کمپیوٹر کی انجینئرنگ" کا کورس کر رہے ہیں۔ پاکستان میں "کموڈ میں کوئی صنعت لگانے کا ارادہ ہے۔ جس کے لئے امریکہ میں مشین ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ ان کے "کمپیوٹری کورس" پر تو چنداں حیرت نہ ہوئی کہ اللہ بخشے ان کے والد راجہ حسن اختر مرحوم بھی 55 برس کی عمر میں قانون کی کلاس میں داخل ہو گئے تھے۔ صنعت سے ان کے پورے خاندان کا لگاؤ کبھی نہ تھا۔ پوچھا "حضرت یہ کیا" ------ بولے ---- "شاہ جی------" الیکشن لڑنے سے تو ہمارا لگاؤ ہے نا ------ اور اب پاکستان میں کموڈ کا "بارانی زمیندار" الیکشن نہیں لڑ سکتا ------ نائلہ' طارق اور کرنل صاحب نے بڑا اصرار کیا کہ ہم آتے ہیں اور آپ کا سامان اٹھا کر اپنے ہاں لے آتے ہیں۔ لیکن یہ مناسب نہ تھا۔ حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے۔ کل شام مشاعرے میں ملاقات طے پائی۔ جس کی پہلی نشست ---- "تقریب یوم اقبال" ------ کی صدارت ہی راجہ ظہور اختر کر رہے تھے۔ اور امریکہ کیا پاکستان میں بھی "تقریب اقبال" کی صدارت کے لئے ان سے زیادہ موزوں اصحاب کم ہی ملیں گے کیونکہ راجہ حسن اختر مرحوم کا شمار حضرت علامہ کے "نیاز مندان مخصوص" میں ہوتا ہے۔ راجہ صاحب کے

بارے میں یہ عام خیال ہے کہ برسا برس تک شائد ہی ایسی کوئی شام گزری ہو کہ راجہ صاحب نے ----- علامہ کی "مٹھی چاپی" کے لئے ----- "جاوید منزل" میں حاضری نہ دی ہو۔ خود ظہور اختر صاحب کا نام بھی حضرت علامہ کا رکھا ہوا ہے۔

ہم لوگ ابھی ناشتے پر ہی تھے کہ نیویارک سے جناب محشر بدایونی اور جناب سرشار صدیقی تشریف لے آئے تو رونق دو چند ہو گئی۔ انہوں نے "امریکن ایئر لائن" کی کاروباری نالائقی' بدتمیزی اور بے پرواہی کا عجیب قصہ سنایا کہ سات بجے کی پرواز پر جانے والے مسافروں کو گیارہ بجے تک انہی "لاروں" پر بٹھائے رکھا کہ ابھی اڑے کہ اڑے۔ گیارہ بجے یہ "مژدہ" سنایا کہ کل روانہ ہوں گے۔ رات ہمارے ہوٹل میں رہیے۔ ہوٹل والوں نے ان پاکستانی شعراء کو جو کمرہ دیا' جناب سرشار صدیقی نے جب اس کے قفل میں چابی لگائی تو اندر سے ایک شخص برآمد ہوا جو "سرشار" ہونے کے علاوہ ----- اس مداخلت بیجا پر ----- سر سے پاؤں تک تقریباً ننگا بھی تھا۔ اور غصے میں بپھرا ہوا بھی تھا۔ ان کو دوسرا کمرہ ملا تو سہی مگر دو بجے جا کر جبکہ صبح پانچ بجے اٹھنا بھی تھا۔ خیر ان کے آنے پر ناشتے کا دوسرا دور ہوا اور لطائف کا پہلا دور۔ جس کے بعد ہم لوگ نچلی منزل میں۔ استراحت کے لئے ----- اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

غالب اور جھیل

آج کا ہمارا سارا دن کچھ میرزا غالب کے ساتھ اور کچھ ڈاکٹر زیدی کی جھیل میں گزرا۔ گھر کی جس "شیشہ گاہ" میں کھانے کی میز لگی ہے' وہاں جھیل اور مکان کی سرحدیں آپس میں اسی طرح گلے مل رہی تھیں جس طرح افغانستان اور روس کی جنگ میں افغانستان اور پاکستان کی سرحدیں۔ جھیل چڑھاؤ پر ہو تو نوالہ ہاتھ میں اور پاؤں جھیل کے پانی میں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح جاڑوں میں جب ساری جھیل جم کر برف کی ایک مسلسل سل بن جاتی ہے' تو آپ بے شک اس پر کھانا کھائیں ----- بیڈ منٹن کھیلیں۔ دوڑیں' کودیں' پھسلیں۔ ہم نے آج دن میں جو کچھ بھی کھایا پیا جھیل کو دکھا دکھا کر ہی نوش جان کیا۔

ڈاکٹر سرور علی زیدی "سرجری" سے ایک مرتبہ دوپہر کے کھانے پر گھر آئے اور دو مرتبہ چائے پر اور شام کے بعد تو خیر وہ رات گئے تک ہمارے لئے وقف رہے۔ ان کی گفتگو بھی اتنی دلچسپ اور لکھنؤ کے سبک اور میٹھے لہجے میں گندھی ہوئی تھی کہ ----- وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ----- مختلف ادبی مسائل کی بحثیں اٹھانے بٹھانے میں بھی وہ ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب مشفق خواجہ کی گہرائیوں میں اترنے کی امنگ رکھتے تھے۔ مگر ان کی گفتگو کا "عاشقانہ محور" میرزا غالب کا تھا۔ ان کی شاعری بھی اور شخصیت بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ حساب تک نکال رکھا ہے کہ آموں کی فصل میں میرزا ایک دن میں اوسطاً کتنے آم کھاتے تھے۔ ایک "نوٹ بک" آپ نے میرزا کے ایسے مشکل' پے چیدہ اور تہہ دار اشعار سے لبالب بھر رکھی ہے' جن میں سے بعض لوگ ایک مفہوم بھی نہیں نکال سکتے اور بعض لوگ ہر شعر میں سے تین تین چار چار مختلف مفاہیم نکال لاتے ہیں۔ انہوں نے کینیڈے کے دس بارہ اشعار یکے بعد دیگرے بحث مباحثے کے لئے "اکھاڑے" میں اتارے محشر صاحب اور راقم الحروف کی نمائندگی زیادہ تر سرشار صاحب ہی کرتے رہے جو تخلیق میں بھی سمندر ہیں اور تنقید کے بھی آشنا و شناور۔ ڈاکٹر صاحب شعر سنا کر پہلے ہم سے (یعنی سرشار صاحب سے) مفہوم پوچھتے۔ وہ بتا لیتے تو "نوٹ بک" میں سے نظم لبا لبائی' اور مولانا غلام رسول مہر وغیرہ جیسے اجل نثار حسین غالب کے معانی بتاتے اور پھر اپنی تاویل پیش کرتے جو فیصلہ کن سمجھی جاتی۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور ادبی شوق۔ لاریوں۔ ٹرکوں' رکشاؤں وغیرہ کے آگے پیچھے لکھے ہوئے "ابیات آوارہ"' "کہاوتوں" ----- "تمثیلوں" -----اور "نعرہ ہائے مستانہ و عاشقانہ" کی ذخیرہ اندوزی کا ہے۔ ----- نوٹ بک" میں ایک طرف میرزا غالب کے اشعار ہیں۔ اور دوسری طرف "رکشائی ابیات" ----- دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی ----- غالب کے بعد ابھی تیسری یا چوتھی رکشا کا شعر سنا رہے تھے کہ کہ "ڈنر" کا وقت ہو گیا جس کا احساس جناب سردار علی انصاری اور جناب خورشید کی آمد سے ہوا جو کھانے پر مدعو تھے۔ انصاری صاحب مقامی پاکستان ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ گزشتہ 14 اگست کو انہوں نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب غلام حیدر وائیں کو یہاں ----- "یوم پاکستان" کی تقریب پر مدعو کیا تھا۔ کھانے پر امریکہ کی زندگی زیر بحث رہی۔ ڈاکٹر زیدی تو اس زندگی کے خاصے قائل معلوم ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ امن اور آزادی کی زندگی ہے۔ اخلاقی بے راہ روی ہمیں ناپسند ہی سہی۔ مگر آزادی بہرحال گھٹن سے بہتر کیفیت ہے جو اپنا توازن خود پیدا کر لیتی ہے ----- ان کے برعکس انصاری صاحب روٹی کے آخری نوالے تک امریکہ کی "تکہ بوٹی" کرتے رہے۔ کہ یہ قوم ----- جانور کو روتی ہے آدمی کو کھاتی ہے!

(7 نومبر)

بساطِ بشاشت

دو نے اِن کو داد دی دو نے بجائیں تالیاں
چند بگڑے دل جوانوں نے سنائیں گالیاں

کوئی بولا مار ڈالا یار اِس فرہاد نے
کوئی بولا خوب لکھی ہے کِسی استاد نے

کوئی بولا شکل بھی محبوب ہے انداز بھی
کوئی بولا گھر سے لیتے آتے کوئی ساز بھی

کوئی بولا گیت بھی دلکش ہے لَے بھی پُر اَثر
کوئی بولا ہاں مگر ہے اک دوپٹے کی کسَر

کوئی بولا واہ کیا کہنا ہے پیارے اور گاؤ!
کوئی بولا چونچ بند اپنی کرو مقطع سناؤ!

ماجد الباقری

کنڈی لگا کے کرتا ہے جب بات فون پر
ہوتے ہیں مشتعل مرے جذبات فون پر

چوہے جھپٹ کے سنتے ہیں کیا اسکے دل میں ہے
بلّی کوئی لگاتی جب گھات فون پر

کس وقت کس جگہ ہوں بتانا محال ہے
ہوتی ہے اب تو پوری ملاقات فون پر

روزانہ گفتگو مرا معمول تو نہیں
ہفتوں کے بعد کرتا ہوں اک بات فون پر

گھنٹی بجا کے بات نہ کرنے کے جرم میں
یوں بھی ہوا کہ ہو گئے دو ہات فون پر

کچھ آپریٹروں نے بھی سن کر بھرا تھا سانس
اس نے جو بات مجھ سے کہی رات فون پر

طیارے کے سفر سے ہوا مختصر سفر
ہوٹل میں آج آئی ہے بارات فون پر

بادل گرج رہا تھا برسنے کا وقت تھا
کچھ دیر پھر بھی کٹ گئی برسات فون پر

بجلی گئی تو ایک خموشی تھی ہر طرف
خاتون ایک تھی کہ اُدھر سات فون پر

سارے ہی لوگ جنکے لئے دوڑتے رہے
معلوم ہو گئے وہی حالات فون پر

ابن مریم ہوا کرے کوئی

مسعود احمد چیمہ

وہ زمانہ اب کہاں جب ابن مریم کسی قسم کی فیس کے بغیر پوری دردمندی اور خلوص کے ساتھ عوام الناس کے درد کی دوا کیا کرتے تھے اور ان کی کوشش سے مردے بھی شفا پاتے تھے' لیکن آج تو ابن مریم سے نسبت رکھنے والے محض مریض کی جیب پر نگاہ رکھتے ہیں۔ دوائے درد دل بیچتے ہیں تو بدلے میں مریض کے کپڑے بھی اتار لیتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مریض ان کا در چھوڑ کر کہیں نہ جائے اگر جائے بھی تو ان کے کسی دوست رشتے دار کے پاس جائے۔ سنا ہے پرانے زمانے میں دوائے دل بیچنے والے اپنی دکان بڑھا بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو یہ لوگ جہاں بیٹھ جاتے ہیں ان کی دکان اسی طرح جمتی ہے کہ اکھڑنے کا نام نہیں لیتی۔

یہ خاکسار ہر وقت یہی دعا کرتا ہے کہ اے مولائے کریم اپنے اس گناہگار بندے کو سپیشلسٹ کی دست برد سے محفوظ رکھنا۔ یہ لوگ پہلے تو مریض کو نیستوں کے پل صراط سے گزارتے ہیں۔ پھر بھی مرض سمجھ میں نہ آئے تو اندازے سے گولہ باری کرتے ہیں اور مختلف دوائیں آزما کر معلوم کرتے ہیں کہ اصل مرض کیا ہے۔ ایسی کوشش اکثر مرض کو پیچیدہ بنا دیتی ہے اور زیادہ تر صورتوں میں مریض اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے یعنی مریض اصل مرض کی وجہ سے نہیں مرتا بلکہ بے شمار دوائیوں کے ضمنی اثرات اس کی موت کا سبب بنتے ہیں۔

ایک بار خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس دائم المریض کو گھیر گھار کر ایک سپیشلسٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ میرے گھر والوں نے پتہ نہیں کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے کسی عزیز رشتے دار سے سفارش کروائی کہ اس ماہر طب نے مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ پھر ہسپتال کے بیڈ پر لٹا کر اس طرح تختۂ مشق بنایا گیا کہ جان کے لالے پڑ گئے' یہاں تک کہ فرشتوں سے باتیں ہونے لگیں۔ چھوٹے ڈاکٹروں میں سے کوئی بھی بڑے ڈاکٹر صاحب کی تجویز کردہ دواؤں میں ردوبدل کے لئے تیار نہ تھا۔ اس چکر میں مریض اگلے جہان منتقل ہو جائے تو

کوئی بات نہیں آخر پروٹوکول بھی تو کوئی چیز ہے۔ بگلا پکڑنے کی ترکیب آزماتے وقت بگلا اڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ترکیب کی جزئیات پر عمل ضروری ہے۔ براہ راست بگلے کو پکڑ لینا تو کوئی استادی نہیں۔

صاحبو! ایک وقت ایسا آیا کہ یہ خاکسار ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا' لیکن نرسیں بے اعتنائی سے ادھر ادھر پھر رہی تھیں جیسے کوئی مکھی یا مچھر قریب المرگ ہو۔ اس عالم میں بھی مرحوم عالم لوہار یاد آ رہا تھا:

واجاں ماریاں بلایا کئی وار میں
کسے نے میری گل نہ سنی

میں تو "واجاں" مارنے کے قابل نہیں تھا' لیکن رفیقۂ حیات وارڈ کے عملے سے رحم کی اپیلیں کرتی رہی۔ آخر ایک جونیئر ڈاکٹر نے "رسک" لیا۔ بڑے ڈاکٹر صاحب کے تجویز کردہ نسخے پر خط تنسیخ کھینچا۔ ڈرپ لگائی جس سے اس بسمل کی حالت سنبھل گئی۔ پھر تمام دوائیں بھی بدل دی گئیں۔ صبح مسیحائے اعظم تشریف لائے تو دیکھا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ چھوٹے ڈاکٹر نے احوال واقعی گوش گزار کئے' اس کے باوجود موصوف نے دواؤں کی تبدیلی پر اظہار ناراضگی کیا اور اپنے تجویز کردہ نسخے پر اصرار کیا۔ یہاں تک کہ ڈسپنسر کو ٹیکہ لگانے کا حکم دے دیا۔ لیکن دیوانہ وحشت میں آ کر تیز بھاگا کہ غزالوں نے بھی اس کا پتہ نہ

پایا۔ خدا کا شکر ہے کہ بیماریوں کی آماجگاہ ہونے کے باوجود تب سے ہسپتال میں داخلے کی ذلت سے محفوظ چلا آتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو انشاء اللہ ہسپتال میں داخلے اور سپیشلسٹوں کے شر سے محفوظ رہوں گا۔ اگر داخل ہی ہونا ہے تو کیوں نہ کسی یونیورسٹی' مدرسے' مسجد' درسگاہ' دانشگاہ' کمپیوٹر گاہ یا کسی تربیتی کورس میں داخل ہوں یا پھر ان پیار کے سجدے کرتا ہوا بارگاہ محبت میں داخل ہو۔ ہسپتال اور تھانہ کسی شریف آدمی کے داخلے کے قابل نہیں۔ میرے ایک دوست نے میرے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا: ------ "تم نے سپیشلسٹ صاحب کو مقررہ فیس ادا نہ کی اور محض سفارش سے کام چلایا گویا دھن کی بجائے دھونس اور دھاندلی کو مشعل راہ بنایا۔ اس وجہ سے اس کام میں برکت نہ ہوئی اور تمہیں ہسپتال سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اگر تم مقررہ فیس ادا کر دیتے تو اس صورت حال سے دوچار نہ ہوتے۔"

ایک بار میرے اسی دوست نے ایک سپیشلسٹ کو 250 روپے فیس دی۔ سپیشلسٹ اس کا واقف کار تھا' جس نے واقف کاری کا بھرم رکھا اور 250 روپے میں سے 5 روپے واپس کر دیئے۔ لہٰذا اس عنایت خسروانہ پر میرا دوست طویل عرصے تک سپیشلسٹ صاحب کا ممنون رہا۔

صاحبو! ہسپتال سے فرار ہونے کے بعد 5 روپے فیس لینے والا ڈاکٹر تلاش کیا جس سے علاج کروانا میری اوقات کے مطابق تھا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ تھوڑی سی ترقی کی تو دس روپے فیس لینے والے ڈاکٹر کے در کے پھیرے لگانے شروع کر دیئے۔ جب صحت کے شعبے میں کچھ بھی خرچ کرنے کو جی نہ چاہے تو محترم ممتاز مفتی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور ان کی عطا کردہ میٹھی گولیوں سے استفادہ کرتا ہوں۔ اسی ڈھنگ سے اپنی زندگی گزر رہی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل سرکاری ہسپتالوں کو عرف عام میں خیراتی ہسپتال بھی کہا جاتا تھا' لیکن اب یہ اصطلاح رائج نہیں رہی۔ شاید لاشعوری طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزاد ملک کے باشندے ہونے کی وجہ سے طبی سہولتیں ہمارا حق ہے۔ اب غیر کی حکومت نہیں کہ طبی سہولتوں کو خیرات کے طور پر قبول کیا جائے۔ اس خیرات کو عوام کے بنیادی حق کے طور پر تسلیم کرنا حکومت وقت کا کام ہے۔

یہاں ایک مولوی صاحب یاد آگئے ہیں۔ مولوی صاحب کو ان کے پرستار نے بتایا:

"مولوی صاحب! ہم نے حلوہ پکایا ہے۔"

مولوی صاحب نے جواب دیا۔ "ساہنوں کیہ" (ہمیں کیا)

پرستار نے عرض کی۔ "جناب عالی! حلوہ آپ کیلئے پکایا ہے"

اس پر مولوی صاحب نے فرمایا۔ "فیر تینوں کیہ" (پھر تجھے کیا)

دوستو! یہی تو فیصلہ کرنا ہے کہ حلوہ کس کے لئے ہے اور کون کھائے گا؟ جن بھوت کھائیں گے یا انسان؟ اگر انسان کھائیں گے تو دو گز لمبے چمچوں سے کھائیں گے یا عام چمچوں سے۔

اگر کوئی ابن مریم ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں کیا۔ نہ مشورہ فیس کے لئے رقم ہوگی اور نہ ابن مریم کے معجزہ نما ہاتھوں سے شفا نصیب ہوگی۔ اس صورت میں دکھی انسانیت اپنے لئے "آب شفا" کے چشمے تلاش کرے گی یا پھر چٹکی بھر خاک اور ٹونے ٹوٹکے میں دکھ کا مداوا پائے گی۔

○

اقراء کمپوزرز

ہر قسم کی کتابیں' رسالے' ڈائجسٹ' بروشر' ہینڈ بلز' پمفلٹ' کتابچے کمپیوٹر کتابت میں کمپوز کرائیے

502۔ ایچ' بالمقابل پوسٹ آفس
گورڈن کالج روڈ' راولپنڈی

اروپ رمنے

تشنہ لب ۔۔۔۔ تشنہ جگر

انوار شریف

صاحب سائنس سے ہمارا اختلاف فقط اس بات پر ہے کہ سائنس نے نو بہ نو آسائشوں لذتوں اور راحتوں کے عوض ہمیں بے سکونی کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے اب ہم انسان کم روبوٹ زیادہ بن چکے ہیں ہماری سوچوں کا محور سیم وزر کے گرد گھوم رہا ہے ہم بنی نوع انسانی کے دکھ سکھ سے بے نیاز مادّی مفادات کی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں اور کشتی کے چاروں اور بھیانک طوفان منڈلا رہے ہیں اس وقت ہماری کیفیت حسرت کے اس شعر کے عین مطابق ہے۔

کوئی سرخُوش ہے کوئی مست ہے کوئی ہے خراب
میکشوں کے عجیب رنگ ہیں میخانوں میں

اصل بات شروع کرنے سے پہلے ایک واقعہ سن لیجیے گئے دنوں کی بات ہے ہم اور ہمارے ایک دوست باہم اتنے شیر و شکر ہوا کرتے تھے کہ ہمارے قریبی شناسا بھی ہمارے ناموں میں تفریق نہ کر پاتے تھے۔ قریباً انھیں دنوں ہمارے اس دوست کے سر میں سیاست کا ایسا سودا سمایا کہ انھوں نے بیٹھے بٹھائے انتخابی دنگل میں کودنے کا اعلان کر ڈالا عین انہی دنوں ہم ایک کاروباری ادارے میں اس کے مالک کے روبرو اپنی غرض سے بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم دونوں دوستوں کے ایک مشترکہ واقف کار وہاں آن پہنچے اور ہمیں ہمارے دوست کے نام سے موسوم کرتے ہوئے الیکشن لڑنے کی مبارک دیتے ہوئے ہم سے بغلگیر ہو گئے۔۔۔ شامت اعمال کہ ہماری زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔۔۔

جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ہمارا شمار شریف لوگوں میں ہوتا ہے--- جن صاحب کے پاس اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے قہر آلود نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے کہا--- آپ کا کیا خیال ہے الیکشن اور سیاست میں حصہ لینے والے تمام کے تمام لوفر لفنگے اور بدقماش لوگ ہوتے ہیں بیشتر اس کے کہ ہم سیاستدانوں کی شان میں مزید کچھ اور قصیدہ کہیں مبارک باد دینے والے صاحب نے یہ کہہ کر ہمارے کان کھڑے کر دیئے کہ ملک صاحب بھی اپنے علاقہ سے الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ شکستہ اوسان بحال کرتے ہوئے ہم نے کہا--- جی نہیں ہرگز نہیں ہم تو صرف یہ عرض کرنا چاہتے تھے کہ سیاست ہم جیسے مرنجاں اور دھان پان لوگوں کے بس کا روگ نہیں اس کے لئے حیثیت مرتبہ اثر رسوخ کے علاوہ جان جسے رعب داب اور ڈانگ ماری کی ضرورت ہے--- ملک صاحب اگر خود اس میدان کے کھلاڑی نہ ہوتے تو ہمارے استدلال سے ان کے لئے اختلاف مشکل ہوتا ہمارا ہاتھ چونکہ براہ راست ان کے گریبان تک پہنچ گیا تھا اس لئے ان کی تیوری کے بل نظر انداز کرنا ہماری مجبوری بن چکی تھی۔

اس بظاہر معمولی واقعہ سے اپنے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کی ہم ہرگز اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ ہمیں بچ بچ سیاست جیسے سائنسی علم سے نابلد شخص جان کر ہماری عقل کا ماتم کریں--- ہمارے کاٹ دار جملہ میں بیزاری کا عنصر سیاست میں ابن الوقتی کے خلاف ہمارے جذبات کا اظہار تھا ورنہ بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہماری ناچیز رائے میں زندہ اور متحرک قوموں کے لئے جمہوری اور سیاسی عمل سے مسلسل آشنائی ان کی ترقی اور بقا کے لئے انتہائی ضروری ہے یہ خود احتسابی کی ایسی چھلنی ہے۔ جس کے عمل کو تواتر اور خلوص نیت سے اپنانے والی قوموں کی بنیاد مضبوط اور سرحدیں محفوظ ہوا کرتی ہیں۔

غور فرمایئے ہمارے آزاد وطن کی عمر نصف صدی کے قریب ہونے کو ہے ہماری کشتی آج بھی طوفانوں کی زد پر ہے ہماری ڈولتی ناؤ کو بہت سے ناخداؤں نے بھنور سے نکالنے کے دعویٰ کے ساتھ ہمارے مقدر کا ناخدا بننے کی کوشش کی کنارا کسی کو بھی نہ ملا (وجوہات متنازعہ ہیں) چند مدعی اس ہماہمی کے دور میں ایسے بھی تھے جن کی آواز دھیمی اور لے مدہم ہونے کے باوجود ارادے مضبوط اور حوصلے جوان تھے جو طوفانوں کا رخ موڑنے کے بجائے ان کی شدت کو محبت کی چاشنی سے کم کرنے کے قائل تھے اس فہرست کو اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں نوابزادہ نصر اللہ خان کا نام بہت ہی نمایاں اور ممتاز نظر آئے گا---

نصر اللہ خان کسی شخص یا فرد کا نام نہیں نصر اللہ خان ایک دور کا نام ہے ادارے کا نام ہے انسٹیٹیوٹ کا نام ہے روایت کی پاسداری دیانت امانت اور قول کی سچائی کا نام ہے نصر اللہ خان سمندر کا نام ہے ایک ایسا سمندر جس کی موجوں میں شور ہے نہ تلاطم ہے نہ اضطراب اور نہ طوفانوں کا ڈر ہے امن و شانتی کے اس سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک محبت اخوت رواداری اور خلوص کی لہریں بل کھا رہی ہیں۔

نواب کا لفظ نصر اللہ خان کے نام کا لاحقہ ہونے کے باوجود ان کا گھر قصر شاہی نہیں بلکہ اس فراخ دل فقیر کے ڈیرے کی مانند ہے جس میں سرے سے دروازہ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی جہاں اپنوں اور بیگانوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور عزت و توقیر سے نوازا جاتا ہے جہاں ہر آنے والی کی حاجت روائی اور دلجوئی کا سامان مہیا کیا جاتا ہے--- نوابزادہ کا دم اس دھرتی اور اس کے باسیوں کے لئے نعمت سے کم نہیں وہ اپنی مٹی اپنی خوشبو اور اپنی روایات کے سچے امین ہیں ان کا رہن سہن سراپا بود و باش سب کچھ اپنی مٹی میں گندھا ہوا ہے وہ کہنہ مشق سیاستدان ہوتے ہوئے بھی ہماری ثقافت تہذیب اور شعر و ادب کا جیتا جاگتا چلتا پھرتا پروقار پرعزم اور پرشکوہ نشان راہ ہیں۔

ان کا شمار ان عظیم لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مغربی کلچر و سیاست کے پیچ و پیچ زندگی کی صبح کو شام میں بدل ڈالا مگر ان کی آنکھیں اس کی مصنوعی چمک سے خیرہ نہ ہو سکیں وہ آج بھی بلند حوصلگی اور استقامت کے ساتھ سائنس کی بے ڈھنگی رفتار اور کردار کے آگے اپنی اور اپنے آبا کی سربلندی کا پرچم تھامے بند بنے کھڑے ہیں--- وہ ہمارے ملک کے واحد نہیں تو ان گنے چنے چند سیاستدانوں میں سے ایک ہیں جن کے ذاتی اثاثے سیاست میں حصہ لینے سے بڑھنے کے بجائے گھٹے ہیں جنھوں نے سیاست سے کچھ لینے کی نسبت ہمیشہ دینا ہی سیکھا ہے ان کے پیش نظر سیاست تجارت نہیں عبادت ہے جس کی اولین شرط بے غرضی اور بے لوثی ہے ہوتا اکثر یوں ہے کہ جس شخص کی شخصیت لکھی جاتی ہے اسے منفی یا مثبت نقطہ نظر سے مضحکہ خیز بنانے کی اپنی سی پوری کوشش کی جاتی ہے ہم ایسا ارادہ ہرگز نہیں رکھتے ہم نوابزادہ کی شخصیت کے روشن پہلو کے ساتھ تاریک گوشوں کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

نوابزادہ ہماری آپ کی طرح گوشت پوست کے انسان ہیں ذاتی پسند و ناپسند کے علاوہ انسانی جبلتوں اور خواہشوں نے ان کا احاطہ بھی کیا ہوا ہے جس

کے سبب ان کے بہت سے ذاتی اور سیاسی فیصلوں پر متنازعہ اور غیر پسندیدہ ہونے کا الزام بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے مجلس احرار سے لے کر موجود جمہوری پارٹی جسے ان کے بہت سے ناقدین تانگہ پارٹی سے موسوم کرتے ہیں ان کے حامی اور مخالفین دونوں کے لئے نکتہ آفرینی کا سامان پیدا کرتی ہے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کی وجہ نوابزادہ کا اختلاف رائے برداشت نہ کرنے کا سبب بھی بتایا جاتا ہے کچھ لوگ نوابزادہ کی چند نفوس پر مشتمل پارٹی کو پریشر گروپ سے بھی تشبیہ دیتے ہیں کچھ کے نزدیک نوابزادہ کی جمہوری پارٹی لفظی انقلاب لانے یا ملک قوم کی تقدیر بدلنے والے جھوٹے اور دلفریب نعروں سے الگ تھلگ حقیقی معنوں میں جمہوری عمل کی آبیاری میں مصروف ہے واہ واہ علی سردار جعفری نے کیا خوب کہا ہے۔

آندھیاں چلتی رہیں افلاک تھراتے رہے
اپنا پرچم ہم بھی طوفانوں میں لہراتے رہے

حقیقت تو یہ ہے کہ جب بھی وطن اور اہل وطن پر کڑا وقت آیا نوابزادہ کی یہ ہی ننھی منی سیاسی پارٹی بڑے بڑے سیاسی اتحادوں کا موجب بنی اور نوابزادہ نے ایسے موقعوں پر اپنی عمر اور جسمانی استعداد سے بڑھ کر فعال کردار کے ذریعہ معجزے کر دکھائے برسوں کے روٹھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو لمحوں میں یکجا کر کے نوابزادہ نے مطلقعنان ایوانوں میں شگاف ڈال دیئے---- یقین مانئے وطن سے آمریت کی ساعتوں کو مختصر کرنے میں نوابزادہ کا کردار انتہائی موثر اور زور اثر رہا ہے وہ ملک کی بقا ترقی اور بہتر مستقبل کو ہر حال میں جمہوری عمل اور اظہار رائے کی آزادی سے مشروط سمجھتے ہیں اور جب بھی اس عمل کو کسی طرف سے ضعف پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو نوابزادہ پر اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے وہ ہر حال میں اپنی بساط کے مطابق ڈھال بن کر میدان میں اتر آتے ہیں ایسے میں ان کے گرد وقت کے ٹھکرائے ہوئے سیاستدانوں کے علاوہ بیلائے اقتدار کے مشتاق بھی منڈلانے لگتے ہیں فیصلے ہوتے ہیں کچھ کی امیدیں بر آتی اور کچھ کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے جن کے مفادات پہ زد پڑے ان کا نزلہ نوابزادہ کے سر گرتا ہے اور پھل کھانے والے نوابزادہ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں آج کی حزب اقتدار کل کی حزب اختلاف میں بدل جاتی ہے کل تک نوابزادہ کے گن گانے والے آج ان کے ہر عمل کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور نوابزادہ من ہی من میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کو گنگنا رہے ہوتے ہیں۔

ذوقِ نگاہ کے سوا شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا مجھ کو خدا نے کیا دیا

غور کے بعد نتیجہ اخذ کرنے والی بات یہ ہے کہ اس کھیل میں نوابزادہ نے آپ سے کیا مانگا یا آپ نے نوابزادہ کو کیا دیا--- آپ انھیں ملک کا وزیر اعظم نہیں بنا سکتے نہ بنایئے صدر مملکت بنانا بھی آپ کے بس میں نہیں سپیکر یا سینٹ کا چیئرمین وہ آپ کو سوٹ نہیں کرتے گورنر بننا ان کے لئے مناسب نہیں وزارت کی کرسی ان کے لئے غیر موزوں آپ کے تمام استدلال ہمیں بسرو چشم منظور و قبول---- مگر اعلیٰ حضرت آپ کی اعلیٰ ظرفی سے ہم یہ توقع بھی نہیں رکھتے کہ آپ نوابزادہ جیسے محترم و معتبر قومی رہنما کو اس سلوک کا مستحق ٹھرائیں کہ دیکھنے والوں کو فٹ بال کے کھیل کا گمان ہونے لگے۔ بس کیجئے---- خدارا بس کیجئے ----- اس کھیل کو بند کیجئے ---- اور جلد کیجئے گر نہیں تو اس کے قوانین پر نظر ثانی کیجئے زیادہ نہیں تو نہ سہی اس کھیل کو اتنا مہذب اتنا شائستہ کم از کم اتنا پروقار تو بنا دیجئے کہ یہ اپنے محسنوں کی عزت و ناموس کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔

رس رابطے

تابش دہلوی

محترم جناب گلزار جاوید صاحب۔

آپ سے پہلی مگر آدھی ملاقات کا شرف آج حاصل ہو رہا ہے' زندگی ہے تو پوری ملاقات بھی ہو رہے گی!

"چہار سو" باقاعدہ موصول ہو رہا ہے' ہر رسالہ کسی زندہ ادیب کی شخصیت اور تخلیقات کو سمجھنے کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے' محترم اشفاق صاحب کا گوشہ نہایت جامع ہے اور ان کے درویشانہ کردار کو نہایت واضح انداز میں سامنے لاتا ہے' محترمہ شبنم شکیل کے مکالمہ سے ان کی پاکیزہ اور محبت سے پر گھریلو زندگی بڑی دلکش نظر آئی اور ادب میں "انکسار" کا یہ جذبہ بہت کم ادیبوں کو میسر ہے اللہ انہیں خوش رکھے' مرحوم عابد علی عابد میرے بڑے کرم فرما تھے وہ جب بھی کراچی آتے اپنی محبتوں سے مجھے نوازتے' اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے!!

جمشید مسرور (ناروے)

مکرمی ضمیر صاحب

"چہار سو" عرصہ دراز سے نہیں ملا۔ یا کم از کم ایسا لگتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے آپ کی یاد آگئی۔ آپ کا خط نکالا۔ پڑھا۔ پھر پڑھا۔ آپ کی محبت بھری باتیں یاد آئیں۔ امید ہے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے۔ اور گلزار جاوید صاحب کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ کدھر کھو گئے؟

نور بجنوری

محبی گلزار جاوید صاحب۔ چہار سو کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح اپنے دامن میں خوبصورت تخلیقات لئے نظر نواز ہوا۔ اس عنایت کے لئے سید صاحب کا اور آپ کا دلی طور پر ممنون ہوں۔

جناب اشفاق احمد کے فن کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ مجھے ان اہل نظر پر رشک آتا ہے جو یہ کام انتہائی دلسوزی اور تابناکی سے سرانجام دے رہے ہیں۔

جناب اختر ہوشیار پوری' مسعود قریشی اور پرتو روہیلہ کی غزلیں بہت خوبصورت تھیں۔ جناب مسعود قریشی کا ایک شعر ذہن میں جگمگا اٹھا ہے

یار کو چاند بنانے کا ہنر رکھتے ہیں
گل ہوئی مشعل دیدلو تو ایسے ہی سہی

حصہ نظم بھی خاصا جاندار لگتا ہے۔ ابھی پوری طرح پڑھ نہیں پایا ہوں۔

جمیل الدین عالی۔ (دوبئ)

لاہور سے نکلتے ہی یہاں آنا پڑا۔ مشاعرے۔ آرام کرنا چاہتا تھا۔ مگر احباب -------- کرم فرماؤں کا حکم بھی نہیں ٹال سکتا۔ لاہور کی روداد شائد امجد اسلام امجد کو لکھ بھیجوں۔ فرصت کشاکش غم ہستی سے گر ملے!

محمد سعید شیخ

برادرم گلزار جاوید!

چہار سو کا نیا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اشفاق احمد کا نمبر ہے۔ مندرجات دیکھ کر ہی تحریروں کی قیمت و قدر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پھر ممتاز مفتی کا مضمون ہے۔

تسلی سے پڑھوں گا رات کی شبنمی خاموشی میں کیوں کہ اس وقت تو دفتر میں بیٹھا ہوں۔ آپ کے رسالے کے لئے کہانی بھی بھیج رہا ہوں۔ بڑی دیر کا قرض تھا۔ ضمیر جعفری کو سلام

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

جناب گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

بھائی میرے پرچہ مل گیا ہے۔ اشتہار نما عبارت کی اشاعت کے لئے بیحد ممنون ہوں۔

اشفاق احمد کے بارے میں تفصیل سے پڑھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی لکھتا اس شخص میں کئی ایسی خوبیاں ہیں جن کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ وہ چونکہ کبھی لڑنے والوں میں سے ہیں۔ افسانہ' ڈرامہ اور صدا کاری بھی ان کے خاص موضوع ہیں۔

پروفیسر پرویز وکیل (سکاٹون۔ کینیڈ)

واشنگٹن میں ایک پرانے مہمان سے ملاقات ہوئی۔ پاکستانی شعر و ادب کے دلدادہ۔ انہوں نے ایک مشاعرے کی وڈیو ٹیپ دکھائی اور بطور خاص اس صراحت کے ساتھ کہ اس میں ضمیر جعفری ہیں۔ سو آپ کو پاکستان میں دیکھ لیا۔ پاکستان سے کوئی تعلق تو نہیں رہا۔ مگر پاکستان سے جب کوئی کتاب یا خط ملتا ہے تو اسی لمحے کو حاصل حیات سمجھتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک بھتیجے نے ممتاز مفتی کی "الکھ نگری" بھیجی۔ آج کل اس کے سرور میں بہے جا رہا ہوں۔ آپ ہی کا ایک شعر یاد آگیا۔

حالات و واقعات کی اک رو ہے جو ضمیر
لے جا رہی ہے اور چلا جا رہا ہوں میں

انجم جاوید

محترم گلزار جاوید صاحب •

آج کی ڈاک سے چہار سو کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ آپ کا چہار سو اس لحاظ سے یادگار شمارہ بن جاتا ہے کہ اس میں کسی بھی ادبی شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اس طرح سے ہر شمارہ ریکارڈ کی حیثیت سے رکھنے کے قابل بھی ہوتا ہے جس طرح سے آپ کے گزشتہ چند شمارے ہیں۔ بانو قدسیہ صاحبہ، مختار زمن صاحب، محسن بھوپالی صاحب، پرتو روہیلہ صاحب اور اب اشفاق احمد صاحب۔ اشفاق احمد صاحب نہ صرف اردو ادب کی قد آور شخصیت ہیں بلکہ سادگی اور محبت کی ایک روشن مثال بھی ہیں۔ اس شمارے میں شبنم شکیل صاحبہ کا ایک انٹرویو (مختصر سا) دیکھا۔ شبنم شکیل صاحبہ نہایت سلجھی ہوئی، شائستہ لب و لہجے اور خوبصورت طرز کی شاعرہ ہیں ان کی شاعری میں تیکھا پن اور طنز کی گہرائی ملتی ہے آج کی بہت سی خواتین شاعرات کی نسبت شبنم شکیل کی شاعری ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

خطوط میں محسن بھوپالی صاحب کا خط بھی نظر سے گزرا، میری جس غلطی پر انہوں نے مری توجہ مرکوز کرائی ہے اس کے لئے شکریہ، جہاں تک بات نو وارد کی ہے تو وہ اپنی جگہ درست ہیں مگر ریکارڈ کی درستگی (یا وضاحت) یہ عرض کرتا چلوں کہ میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانے "کالی کوئل" سے کیا تھا جو دسمبر 1983ء میں روزنامہ آغاز (کراچی) میں شائع ہوا تھا اس کے بعد بھی افسانے لکھے اتنا ضرور ہے کہ اکثر افسانے میں نے ان رسائل کیلئے لکھے جو معاوضہ بھی دیتے ہیں اور ادبی جریدوں میں "اقدار" "ادب لطیف" اور "اردو پنچ" میں بھی میرے افسانے آچکے ہیں۔ یہ اور بات کہ میری تھوڑی بہت شہرت میں میری شاعری کا زیادہ ہاتھ ہے۔

راشد علی زئی (حضرو)

گلزار جاوید صاحب دو ماہ کا "چہار سو" اکٹھا چھاپ کے بے غم ہو گئے گویا دو ماہ کیلئے آپ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ پچھلے دنوں لاہور گیا تو علمی و ادبی احباب سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی سے "چہار سو" کے سالنامے کا بھی ذکر ہوا۔ انہوں نے بڑی خوشی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور بڑی دیر تک "چہار سو" اور آپکا ذکر خیر رہا۔

افضل گوہر

حسب وعدہ ایک غزل سعید گوہر صاحب کی اور دو غزلیں ہمارے سرگودھا کے شاہ صاحبان ہیں ان میں سے قاسم شاہ تو وہی ہے جس نے بھلوال کے مشاعرے میں جو آپکی زیر صدارت ہوا غزل پڑھی تھی اور مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔

نصیر احمد ناصر (الریاض۔ سعودی عرب)

ڈاکٹر انور نسیم بہت مخلص انسان اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ یہاں ان کا دم تہذیبی فروغ کے لئے بے حد غنیمت ہے۔ گزشتہ دنوں انہوں نے میری کتابوں ----- "دسمبر اب مت آنا" ----- اور ----- "زرد پتوں کی شال" ----- کے حوالے سے میرے اعزاز میں اپنے گھر میں ایک پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا۔ طعام کے بعد کلام کی ایک غیر رسمی شعری نشست بھی ہوئی۔

○

عنایت علی خاں کے طنزیہ مجموعوں

ازراہ عنایت۔

مطبوعہ فیروز سنز لاہور

عنایات

مطبوعہ یادگار پبلشرز حیدر آباد

کے بعد اب بچوں کے لئے دلکش دیدہ زیب اور تربیتی کتب

1۔ مسکراتے پھول (منظومات)

2۔ مزیدار کہانیاں قصے اور ڈرامے

مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لاہور

قیمت بالترتیب 15 اور 21 روپے۔

میرزا ادیب کے کام پر پی ایچ ڈی اور ایم فل

برصغیر کے سینئر اور نامور ادیب، میرزا ادیب نے اردو ڈرامہ نگاری کے میدان میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں ان کا اعتراف دوسرے ممالک کے علاوہ بھارت میں خالص علمی سطح پر بھی ہونے لگا ہے۔ بھارت سے موصول ہونے والی ایک اطلاع کے مطابق ایل این متھیلا یونیورسٹی دربھنگا نے پی ایچ ڈی کیلئے ایک پروجیکٹ منظور کیا ہے جس کا عنوان ہے "میرزا ادیب بطور ایک ڈرامہ نگار......" اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے محترمہ زہرہ شائل ایم اے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر رہی ہیں۔ زہرہ شائل کے تحقیقی کام کی نگرانی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر شاکر خلیق کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ اس سے قبل بھی بھارت میں میرزا ادیب کے کام پر جمیل اختر کمال ایک اور پہلو سے پی ایچ ڈی کیلئے تحقیق میں مصروف ہیں۔ پی ایچ ڈی کی اس تھیسس کا عنوان "اردو افسانے کے ارتقاء میں میرزا ادیب کا حصہ" ہے۔ مارواڑی کالج بھاگلپور شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اس تحقیقی کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ قبل ازیں عثمانیہ یونیورسٹی بھارت کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست کی زیر نگرانی محمد تاتار خان "میرزا ادیب کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے 1987ء میں ایک تھیسس لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر انور نسیم اسلام آباد میں

پاکستان کے ممتاز دانشور اور سائنس دان ڈاکٹر انور نسیم تیس برس تک کینیڈا اور اقوام متحدہ اور ریاض سعودی عرب کے علمی اور سائنسی اداروں میں اعلیٰ مناصب پر خدمات انجام دینے کے بعد مستقل قیام کے لئے اسلام آباد آگئے ہیں۔

اسلام آباد مشاعرہ

اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے نے جشن اسلام آباد کی تقریبات میں ایک مشاعرے کا بھی اہتمام کیا۔ سید ضمیر جعفری نے صدارت کی جبکہ مولانا کوثر نیازی مہمان خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض پروین شاکر نے ادا کئے۔ احمد فراز ایک مدت کے بعد اسلام آباد کے کسی مشاعرے میں شریک ہوئے۔

کینیڈا سے اشفاق حسین کی آمد

معروف شاعر اور نقاد اور "اردو انٹرنیشنل" (ٹرانٹو) کے مدیر جناب اشفاق حسین نومبر93ء کے پہلے ہفتے میں اسلام آباد آئے تو اسلام آباد میں ان کی مرتبہ کتاب "فیض کے مغربی حوالے" کی تعارفی تقریب منعقد کی گئی۔ صدارت بیگم ایلس فیض نے کی۔ بیگم آمنہ مجید ملک مہمان خصوصی تھیں۔ اظہار کرنے والوں میں افکار عارف اور پروفیسر خواجہ مسعود شامل تھے۔ "انجمن لوح و قلم" نے اشفاق صاحب کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت سید ضمیر جعفری نے کی۔